



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ---

السلام علیکم احباب-----"

"ناولز کی دنیا" کے ناولز میں خوش آمدید ----

ناولز کی دنیا "ویب سائیٹ / گروپ / پیج" دے رہا ہے تمام لکھاریوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں آپ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اپنے قلم سے تحریر کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں --- اگر آپ کو بھی اللہ کی طرف سے یہ صلاحیت دی گئی ہے تو اسے اجاگر ضرور کریں --- ہمیں آپ جیسے ہی لکھاریوں کی تلاش اور ضرورت ہے ---

اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں -- اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ جتنا جلدی ہو سکا آپکی تحریر پوسٹ ہو جائے گی ---

مزید تفصیلات یا کسی بھی طرح کی مدد کے لیے ہم سے گروپ یا پیج انباکس میں رابطہ کریں یا ای میل پر ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں --

Email address :- Novelskiduniya77@gmail.com

Facebook page :- [Novels ki duniya](#)

(user name [@zoyatalib77](#))

Facebook group :- [Novels ki duniya](#)

Instagram Page:- [Zoya Talib](#) (UserName: [Novelskiduniya77](#))

Youtube Channel: Novels Ki Dunya (NKD) Official

(پر خیال رہے کہ یہ گروپ زویا طالب کا ہی ہو)

اور باقی کے رابطے کے لیے ہر پیج کے نیچے **Blue** الفاظ میں لکھے لفظ میں آپکو لنکس مل جائے گے ان سب کے --

لکھا ہے ان دونوں کو وزٹ کرنے کے لیے لکھے ہوئے پر ہی کلک کریں اور اوپن کر لیں ---

شکریہ-----

حُب

از قلم: مَر حبان قُطب

ساتویں قسط:

"کیا بات ہے آج آفس میں لیٹ تو آئی ہو مگر مُوڈ بہت خوشگوار ہے تمہارا۔" اندر آتے عباد کی بات پر اُسکی مُسکراہٹ ہمیشہ کی طرح سِمنے کے بجائے مزید گہری ہو گئی۔ عباد وہیں دروازے میں جم کر اُسکو دیکھنے لگا کیونکہ دوپہر کے تین بج رہے تھے اور زُخرف کا مُوڈ ابھی تک خوشگوار ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

"بس ایسے ہی۔" فائل پر سائن کرتے ہوئے جواب بھی مُسکراتے ہوئے دیا گیا۔ عباد سنبھل کر دروازہ بند کر کے اندر آیا۔

"سب خیریت ہے نہ؟" وہ پوچھنا کچھ اور چاہتا تھا مگر زُخرف سے وہ پرسنل سوال نہیں کر سکتا تھا۔

"اللہ کا کرم! عباد وہ جو پیرس والی کلائینٹ ہے ہماری، اُنکو کچھ انٹیریر کے سمپلز دکھانے ہیں، میں بس وہیں جا رہی ہوں۔ واپسی پر کچھ دیر ہو جائے گی۔" کچھ فائلز اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عباد نے سر ہلا کر ہاتھ میں تھما ٹیب اُسکے آگے کیا۔

"یہ بھی ساتھ لے جاؤ، کچھ ریفرنسز ہیں اس میں پچھلے ایونٹز کے۔" زُخرف نے سر ہلا کر ٹیب بیگ میں رکھ کر کندھے پر پہن لیا۔

"واپسی پر کہیں جاؤ گی؟" اُسکو خود سے مُسکراتے دیکھ کر وہ کہے بنا رہ نہیں سکا۔

"ہاں۔۔۔ وہ ہاسپٹل جانا ہے عیادت کے لیے۔" گاڑی کی چابیاں اُٹھا کر کہا گیا۔ اُسکے ہر انداز میں بے حد اطمینان تھا۔

"ہیں! خیریت، کس کی عیادت کے لیے؟" عباد کی حیرت اُسکی خوشی دیکھ کر بجا تھی۔

"مَنْصُور کی!" چمکتی آنکھوں سے کہہ کر عباد کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ اُسکو وہیں ساکن کر گئی۔ چہرہ پھیر کر وہ آفس کے کُھلے دروازے سے اُسکو سب سے خوش و خرم مل کر جاتے دیکھتے ہوئے اپنی دھڑکیں شمار کرتا رہ گیا۔ اُسکی گاڑی آفس کی پارکنگ لاٹ سے نکل کر ہاسپٹل کی پارکنگ لاٹ میں آ کھڑی ہوئی مگر اُسکی مُسکراہٹ تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کاؤنٹر سے رُوم نمبر کا معلوم کر کے وہ جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولنے لگی، دوسری جانب سے کھولے جانی پر ٹھہری اور پھر پی کیپ پہنے شخص کو نکلتے دیکھ کر ٹھہر گئی۔ سیاہ لباس اور سیاہ ہی پی کیپ ملبوس شخص نے تیزی سے اپنا چہرہ اُٹھایا اور زُخرف اُن سیاہ آنکھوں کی سختی اور سیاہی دیکھ کر نہ جانے کیوں تیزی سے پیچھے کو ہوئی۔ دَسْتگیر نے سنبھل کر پی کیپ قدرے آگے کی اور اُسکے برابر سے ہو کر گزر گیا۔ چہرہ پھیر کر

زُخْرُف نے اُجھن سے اُسکو دیکھا جو پلٹے بغیر تیز قدموں سے راہداری میں دُور جاتا ہو کانوں میں سفید رنگ کے ایر پوڈز لگا رہا تھا۔ سر جھٹک کر وہ دروازہ دھکیل کر اندر آ گئی۔

"کیسے ہو منصور؟" چہرے سے مسکراہٹ غائب کرنے کا تکلف بالکل نہیں کیا گیا۔ سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھتے ہوئے منصور نے خود کوئی سخت سی بات کہنی چاہی مگر شدت سے دُکھتے جڑے نے اُسکو بولنے کی طاقت نہیں دی۔ چہرہ ہلکے سے پھیرتے ہوئے وہ زُخْرُف کو دیکھنے لگا جو چمکتی آنکھوں سے اُسکی بُری حالت کو تفصیلی دیکھ رہی تھی۔

"اللہ منصور! یہ کس نے کیا تمہارے ساتھ؟" لہجے میں مصنوعی تفکر سمو کر کہتے ہوئے اُس نے منصور کا زخموں سے چُور چہرہ لال بھبھوکا کر دیا۔

"تم۔۔۔ تم کیا کرنے آئی ہو۔۔۔ یہاں؟" باؤشکل ضبط کر کے کہا حالانکہ جی چاہ رہا تھا اُسکا اٹھ کر حشر بگاڑ دے جسکی وجہ سے وہ اس حال میں تھا۔

"ظاہر ہے تمہاری خیریت معلوم کرنے۔ تمہاری ٹھوکائی کا سنا تو رہا نہیں گیا مجھ سے۔" قدرے چہرہ اٹھا کر اُسکے ایک ایک زخم کو دیکھتے ہوئے وہ دل میں بے حد حیران اور اُلجھی ہوئی تھی مگر چہرے پر جو خوشی تھی وہ چُھپائے نہیں چُھپ رہی تھی۔ وہ اس بات سے اُنجان تھی کہ اُن دونوں کی گفتگو کوئی تیسرا بھی سُن رہا ہے، کوئی ایسا جو یہاں نہ ہو کر بھی اپنی گہری پُچھاپ چھوڑ کر جا چکا تھا۔

"ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں کب تک یہاں رہو گے؟" اُسکے لہجے میں جو احساس تھا، وہ کوئی اور تیسرا شخص اپنے دل میں اُترتے محسوس کر رہا تھا۔ اُسکے الفاظ کی با نسبت وہ لہجہ بے حد متنفر تھا۔

"مجھے لگتا نہیں تھا کہ میری بددعاؤں میں اثر ہو سکتا ہے۔" اُسکی بات کا منصور پر کچھ اثر نہیں ہونا تھا مگر وہ تیسرا شخص، اُسکی ہستی ساکن ہو گئی۔

"بڑی فرصت سے ہاتھ صاف کیا ہے کسی نے تم پر۔ میرے علاوہ کون ہے تمہارا دشمن۔۔۔" پُرسوچ اُنکی ٹھوڑی پر اُکاتے ہوئے وہ منصور کو پیچ و تاب کھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"اُسے بھی دیکھ لوں گا۔۔۔ اور۔۔۔ اور تمہیں بھی۔" بایاں ہاتھ جبرے تک لے جاتے ہوئے اُس نے بڑی دقت سے کہتے ہوئے زُخرف کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

"اچھا لیکن ابھی تو کچھ ہفتوں تک تم یہیں ہو نہ تو اپنی حالت دیکھو۔" اُسکے پیٹی میں جھکڑے دائیں ہاتھ کو دیکھتی ہوئے وہ جو چونکی تھی، سنبھل کر کہنے لگی۔ منصور جانتا تھا وہ سوال نہیں ہے بلکہ وہ اُسکی حالت سے حظ اُٹھا رہی ہے۔ بغیر مزید کچھ کہے وہ پلٹ کر باہر جا رہی تھی کیونکہ وہ اس سے زیادہ اس شخص کو اس حال میں بے بس بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں سے اُسکو سیدھا اپنی کلائینٹ سے ملنے جانا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں کھڑی گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے وہ کسی کی گہری، متفکر، سوچتی نظروں سے بے پرواہ ہاتھ میں تھامے ٹیب میں مگن تھی۔ اُسکو گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھ ہی دستگیر نے سر پر پہنی سیاہ پی کیپ اُتار کر پسینہ سیٹ پر رکھی۔ کانوں میں موجود ایئر پوڈز بھی نکال کر ڈیش بورڈ پر پھینکے اور پھر سٹیرنگ ویل پر زور سے مکہ مارتے ہوئے، اُسکے دماغ کی شریانیں بھٹنے کے قریب تھیں۔ آنکھوں میں آتی دُھند جھٹک کر اُس نے اپنا ہاتھ سٹیرنگ ویل سے پیچھے کیا اور وہاں خون کے دھبے دیکھے جاسکتے تھے۔ گاڑی سٹارٹ کر کے اپنی آفس کے راستے پر جاتے ہوئے اُسکا چہرہ برف کی مانند سخت اور آنکھیں لہو چھلکا رہی تھیں۔

"احمد دُرانی صاحب سے ملاقات نہیں ہو رہی دو دن سے، یہیں ہیں یا باہر؟" کھانے کی ٹیبل پر سیف صاحب کے کہنے پر سب ہی اُنکی جانب متوجہ ہوئے سوائے کسی گہری متفکر سوچ میں غرق مُصطفیٰ صاحب کے۔ دَسْگِیر نے بغور اپنے باپ کے پریشان چہرے کو دیکھا اور پھر ہاتھ میں تھامے سیل فون کی جانب متوجہ ہو گیا جہاں ارمان کے میسجز آرہے تھے۔

"اسلام و علیکم تایا جان!" زُخْرُف کی آواز پر دَسْگِیر کی چہرہ اُٹھانے کی ہمت نہیں ہو سکی۔

"بجو۔۔۔!" سبیل اور زینی نے حیرت بھری خوشگواریت سے اپنی بجو کو آج رات کے کھانے کی میز پر بڑے عرصے بعد دیکھا اسی لیے حیرت یقینی تھی۔ زُخْرُف نے ایک مُسکراتی نگاہ اُن دونوں پر اُچھال کر مُصطفیٰ صاحب کو دیکھا اور پھر چونک کر باقی سب کو نظر انداز کیے اُنکی جانب بڑھی جنہوں نے ہمیشہ کی طرح آج اُسکے سلام پر اُسکو نہیں دیکھا تھا۔

"تایا جان۔۔۔" اُنکے پاس آکھڑے ہوتے ہوئے اُسکی تشویش بھرے انداز پر سب جو باتوں میں مگن ہو گئے تھے، مُصطفیٰ صاحب کو دیکھنے لگے۔

"تایا جان۔۔۔!" قدرے اونچی آواز میں بے چینی سے کہتے ہوئے اُس نے اُنکا کندھا ہلایا جبکہ دَسْگِیر نے چہرہ اُٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا جو ایسے چونکے جیسے کوئی نیند سے ایک جھٹکے سے بیدار ہوتا ہے۔

"بھائی جان! آپکی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" سیف حیدر تیزی سے کرسی دھکیل کر کھڑے ہوئے جبکہ مُصطفیٰ صاحب نے اُنکو دیکھا اور پھر سنبھلے۔

"ہا۔۔۔ہا۔۔۔" زُخْرُف کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اُنہوں نے خود کو سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے چہرہ اٹھا کر اُسکو اور پھر کھانے کی میز پر موجود سب افراد کو دیکھا جو کھانا چھوڑ کر اُنکو تشویش سے دیکھ رہے تھے۔

"آپکی طبیعت ٹھیک ہے نہ؟" نرمی سے کہہ کر اُس نے اُنکا ٹیبل پر رکھا ہاتھ تھام کر دیکھا۔ دَسْتِگِیر کے علاوہ باقی سب اُنکو چہرہ اٹھائے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کے ہاتھ کتنے سرد ہو رہے ہیں۔" اُنکے ہاتھ سہلاتے ہوئے وہ حقیقتاً اُنکی خاموشی پر متفکر ہو رہی تھی۔

"نہیں، بیٹا! ٹھیک ہوں میں بالکل۔ تم بیٹھو میرے ساتھ۔" اُنکے کہے جانے پر وہ جسے ذرا بھی تسلی نہیں ہوتی تھی، اُنکے برابر کی خالی کرسی دھکیل کر خاموشی سے بیٹھ گئی کہ سب کی موجودگی میں وہ اُن سے اصل بات اُگلا نہیں سکتی تھی۔

"سب خیریت ہے بابا جان؟" دَسْتِگِیر نے وقفے بعد سنجیدگی سے کہتے ہوئے مُصْطَفٰی صاحب کو چونکا دیا۔ اُنہوں نے چہرہ پھیر کر اُسکو دیکھا جسکی خاموش نظریں اُنکی جانب ہی بڑی فرصت سے متوجہ تھیں۔ اُنکے کانوں میں پرسوں رات کی باتیں گونجنے لگیں مگر اُنہوں نے سر جھٹک دیا۔

"میں ٹھیک ہوں، بیٹا۔ بیٹھو یہاں اور کھانا کھاؤ میرے ساتھ۔" زُخْرُف کو نرمی سے دیکھتے ہوئے اُنہوں نے اپنے ساتھ پڑی خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا جبکہ فیروزہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔ چہرے پر ناگوار شکنوں کا جال سا بچھنے لگا۔

"کیا پوچھ رہے تھے تم سیف؟" زُخْرُف کو بیٹھتا دیکھ کر اُنہوں نے سیف صاحب کو دیکھا جبکہ دستگیر کی سماعتیں چونک گئیں۔

"احمد دُرانی صاحب کا پوچھ رہا تھا کہ کہاں ہیں آج کل؟" اُنکے سوال پر زُخْرُف نے چہرہ پھیر کر بتایا جان کو دیکھا۔

"وہ اپنے ضروری کام سے فرانس گیا ہے۔" مُصطفیٰ صاحب نے کہہ کر دستگیر کو چونکا دیا۔ اُسکا چہرہ ویسے ہی بے تاثر تھا مگر اندر سے وہ احمد دُرانی کو لے کر ٹھٹک گیا تھا۔ جب دعوت پر وہ اُن سے ملا تھا تب بھی وہ اُسکو اندر تک اتر جاتی نظروں سے مشکوک کر گئے تھے اور اب اُنکا فرانس جانا۔ میسج کی ٹون پر اُس نے سیل فون نکال کر دیکھا اور سامنے نظر آتے نام کو دیکھ کر وہ کرسی پیچھے دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"دستی! کھانا تو سہی سے کھاؤ۔" فیروزہ بیگم کے کہنے پر وہ جو سیل فون کی سکرین کو گھور رہا تھا، اُنکو دیکھنے لگا جن کے چہرے پر ناگواری اور تفکر دونوں نمایاں تھے۔

"بس! کھا چکا ہوں۔" ثُشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُس نے ایک نظر غیر دلچسپی سے کھانا کھاتے اپنے باپ اور پھر زُخْرُف کو دیکھا جو اُنکو ہی دیکھ رہی تھی اور پھر تیزی سے پلٹ گیا۔ پیچھے ماریہ اور فیروزہ بیگم ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ باقی سب اپنے کھانے میں مگن رہے جبکہ ایک دوسرے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں ضرور کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔

راہداری سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک محتاط نظر اطراف میں ڈال کر اُسی نمبر پر کال ملائی جس سے میسج بھیجا گیا تھا۔ پہلی بیل پر ہی کال اُٹھالی گئی۔

"ماسٹر! کوئی بندہ یہاں آپ کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔" دوسری جانب بتائے جانے نے اُسکو ٹھٹکا دیا۔

"کون؟" لفظی سوال کیا گیا حالانکہ جانتا تھا کہ کون ہو سکتا ہے۔

"کوئی پاکستان سے آیا ہوا بزنس مین ہے احمد ڈرانی۔" اُس معلومات پر دستگیر نے گہرا سانس لیا۔
 "کس مقصد کے لیے؟" اگلے سوال پر فون کی دوسری جانب شخص نے اپنے سامنے روشن لا تعداد کمپیوٹرز میں سے ایک کے کی۔ بورڈ پر ہاتھ چلائے اور پھر روشن سکرین پر معلومات آنے لگی۔
 "وہ کسی قاسم نامی بندے کو تلاش کروانا چاہتا ہے۔" داڑھی کھجاتا دستگیر کا ہاتھ تھام گیا۔
 "یقیناً ڈیسٹر کا پوچھ رہا گا تو اُسکو میرا نمبر پہنچا دو۔" کچھ سوچ کر کہتے ہوئے اُس نے دوسری جانب موجود شخص کو بے طرح چونکا دیا۔

"مگر ماسٹر وہ بندہ۔۔۔" اُس نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔۔۔ اور ٹیم سے کہو اس قاسم نامی شخص کو پاتال سے بھی ڈھونڈ کر نکالنا پڑے تو نکال لائیں۔ اس ریکوسٹ ناٹ این آرڈر۔" اُسکی بات نے اُس شخص کو ساکن کر دیا۔ آج سے پہلے اُنکے ماسٹر نے کبھی ریکوسٹ نہیں کی تھی۔ ہمیشہ آرڈر دیئے تھے اور اب ریکوسٹ کیوں؟

"اوکے ماسٹر!" بات سمیٹتے ہوئے کہہ کر اُس نے جلدی سے کہا اور سر اثبات میں ہلا کر دستگیر نے کال منقطع کر کے سیل فون کو دیکھا جہاں ازبیللا اور میکس کے میسجز اُسکو منہ چڑھا رہے تھے۔ گہرا سانس

لے کر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ آخر احمد دُرانی، قاسم نامی شخص کی تلاش میں فرانس تک کیوں پہنچ گئے؟ اس سوال کا اُسے آج ہی جواب چاہیے تھا۔

آج جمعہ تھا سو ملک ہاؤس کے سب افراد گھر پر ہی تھے کیونکہ سب جلد گھر آ جاتے تھے جمعے کی نماز اور کھانے کے بعد سب ہی ہال میں بیٹھے ہوئے باتوں میں مشغول تھے۔ اُن سب میں صرف زُخرف موجود نہیں تھی۔ دستگیر صائم سے باتیں کرتا گا ہے بگا ہے اپنے باپ کے خاموش، پریشان چہرے پر ایک نظر ضرور ڈال لیتا۔ آخر اُس سے رہا نہیں گیا۔

"بابا جان! سب خیریت ہے نہ، کوئی بات آپکو پریشان کر رہی ہے؟" دستگیر کے کہے جانے پر سب ہی اپنی باتیں ترک کر کے مُصطفیٰ صاحب کو دیکھنے لگے اور وہ جو اپنی کسی سوچ میں منہمک تھے، چونک کر دستگیر کو دیکھا جسکی اندر تک اُترتی نظریں اُن پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ لمحے بھر کو اُنکا ذہن بھٹکا مگر یہ صرف اُنکا وہم تھا جسکا حقیقت سے یقیناً کوئی تعلق نہیں تھا۔

"نہیں بیٹا! ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ سب کو مطمئن کر سکتے تھے مگر دستگیر کو نہیں اور وہ یہ جانتے بھی نہیں تھے۔

"اسلام و علیکم!" زُخرف کی پُکار پر وہ جو ساکن ہوا تھا، چہرہ نہیں پھیر سکا۔ اُسکی نظریں اپنے باپ پر ہی جمی ہوئیں تھیں جنکی نظریں زُخرف کو دیکھ کر پریشانی اور تفکر سے مزید لبریز ہونے لگیں یعنی۔۔۔ اُسکی بھیجی گئی ریکارڈنگ وہ سُن چکے تھے۔

"وعلیکم اسلام۔۔۔۔۔ شکر ہے بجو آپ آگئیں۔" سب کے سلام سے پہلے جُوش سے اُٹھ کر سلام کرنے والا سبیل تھا۔ زُخرف نے مُسکرا کر اُسکو دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اُسکے بکھرے بال سنوار دیئے۔

"آپ کی کیسی طبیعت ہے تایا جان؟" اُسکا مدار صرف مُصطفیٰ صاحب تھے جن کے گرد وہ کئی سالوں سے گھومتی آ رہی تھی اور یہ بات اُسکو بغور دیکھتے سیف اور مُرتضیٰ صاحب بخوبی جانتے تھے۔ وہ جو اُنکی موجودگی کو ہمیشہ سے کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔

"اللہ کا شکر بیٹا۔" اُسکی جانب اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُنہوں نے اتنی مُجت اور اُداسی سے کہا کہ زُخرف نے چونک کر اُنکا بڑھا ہاتھ تھام لیا۔

"آپکو کوئی بات پریشان کر رہی ہے نہ تایا جان۔" اُسکے یوں یقین سے کہے جانے نے سب کو چونکا دیا۔ صرف دستگیر اور زُخرف تھے جنہوں نے اُنکے مُسکراتے چہرے کے پیچھے چھپی پریشانی اور تفکر کو بھانپ لیا تھا، سب کی حیرت بجا تھی۔

"ایسا نہیں ہے میرا بیٹا۔" وہ مُسکرا رہے تھے مگر اُنکی آنکھوں کی تھکن، زُخرف کو بے چین کر رہی تھی۔

"یہ دو، تین دن سے نیہا نظر نہیں آ رہی؟" یاد آ جانے پر عروہ نے کہا۔ باقی سب اُسکو چہرہ پھیر کر دیکھنے لگے۔

"کیوں آپکو گھر کا سکون پسند نہیں آ رہا۔" بڑے ہی مزے سے یہ کہنے والی زینی تھی۔ سب نے فیروزہ بیگم کے سخت ہوتے چہرے کو دیکھ کر اپنی مُسکراہٹ دبائی۔

"زینی!" اندر آتی ماریہ چچی نے زینی کی بات سُن کر سختی سے سرزنش کی مگر زینی کندھے آچکا کر رہ گئی۔

"بھابھی! نیہا کیسی ہے؟ کتنے دن سے چکر ہی نہیں لگا۔" ٹریفل کا باؤل ٹیبل پر رکھتیں نگار بیگم کی جانب سے سوال آیا۔

"میں کل گئی تھی اُسکی خیریت پوچھنے۔ نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے بچی کو کہ تین دن سے بستر سے لگی ہوئی ہے۔" فیروزہ بیگم کے پریشانی سے کہے جانے نے ہال میں موجود سب افراد کو ٹھٹکا دیا۔ نیہا گھر میں کسی بھی ہال میں آرام کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ صحت مند ہو یا بیمار، ملک ہاؤس ہر ایک دن بعد پھیرا ضرور لگانے آتی۔

"ہائے میں مر گئی بھابھی! کیا ہوا ہے نیہا کو؟" ماریہ بیگم کے دل ہر ہاتھ پڑا تھا۔ وہ اُنکی بساط کا سب سے تنگڑا پیادہ جو تھی۔

"اللہ جانے ماریہ! کس کی منحوس نظروں سے گزری ہے بچی جو کسی پل آرام نہیں آ رہا۔" اب کے زُخرف اچھی طرح جانتی تھی کہ توپوں کا رُخ اُسکی جانب ہے۔

"لیکن ہوا کیا ہے بھابھی، ڈاکٹر کے پاس گئی ہے؟" دستگیر نے چہرہ جھکا لیا۔ زُخرف اور مُصطفیٰ صاحب کی نظریں ایک ساتھ سامنے سر جھکا کر بیٹھے دستگیر تک گئیں۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اُسکو شاید شک لگا ہے، یا ڈر گئی ہے کسی چیز سے۔" وہ بات ایسی تھی کہ دستگیر اپنی مسکراہٹ ضبط نہیں کر سکا۔ اُسکی ضبط کے باوجود نکلتی مسکراہٹ کو دیکھ کر زُخرف اور تایا جان نے ایک دوسرے کو پھیلتی آنکھوں سے دیکھا۔

"اچھا ہے! کچھ دن تو کان ٹھنڈے رہیں گے۔" اُسکی بڑبڑاہٹ پر فیروزہ بیگم نے کرنٹ کھا کر اُسکو اور پھر ماریہ کو دیکھا۔

"کیا بات کر رہے ہیں دُستی بھائی۔ ساری زندگی آپ نے اُس کے ساتھ ہی گزارنی ہے۔" یہ کہنے والی وردہ تھی۔ مُصطفیٰ صاحب نے چہرہ پھیر کر اپنی زوجہ کو دیکھا جنکا چہرہ لُٹھے کی مانند سپید پڑ گیا تھا جبکہ دستگیر نے جن نظروں سے وردہ کو دیکھا، وہ سب کو دنگ کر گئیں۔

"دماغ تو سہی ہے نہ تمہارا۔ میں کیوں اُس مصیبت کے ساتھ زندگی گزارنے لگا۔ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" اُسکے تیز لہجے پر سب ہی ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ جبکہ وردہ اس عزت افزائی پر سُرخ چہرہ لے کر پیچھے ہوئی۔ نگار بیگم نے بغور ماریہ اور فیروزہ بیگم کو دیکھا جنکا چہرہ دور سے دیکھنے کے باوجود برف ہوتا لگ رہا تھا۔

"ہیں؟ آپ اُنکو پسند کرتے ہیں نہ یا کرتے تھے۔" فروہ کو سمجھ نہیں آئی کہ وردہ کی عزت افزائی کہ بعد کیا کہے جبکہ دستگیر کی آنکھیں سُرخ ہونے لگیں۔ وہ عورت عذاب تھی، نہ ہو کر بھی۔

"بابا، سمجھالیں اِسکو۔ ورنہ دوبارہ ایسی بات کہی تو لحاظ نہیں کروں گا۔" مُصطفیٰ صاحب کو دیکھتے ہوئے اُس نے جس سختی سے کہا۔ سیف اور مُرتضیٰ صاحب کو سمجھ نہیں آئی کہ ہو کیا رہا ہے۔ فروہ کا رنگ فق ہوا۔ آج سے پہلے دستگیر نے یوں سب کے سامنے جھاڑ نہیں پلائی تھی کبھی۔

"کیا ہو گیا ہے بیٹا، ایسے بہنوں سے بات نہیں کرتے۔" ماریہ چچی کے تیزی سے کہے جانے پر دستگیر نے چہرہ پھیر کر خاموشی سے اُنکو دیکھا۔

"نیہا نے ہمیں بتایا تھا کہ آپ اُسے پسند کرتے ہیں۔" وردہ کی زبان میں پھر سے خارش ہوئی۔ زُخرف نے چونک کر دستگیر مُصطفیٰ کو دیکھا۔

"ان ہی حرکتوں کی وجہ سے آپکی بھانجی میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے گی کسی دن امی۔" وردہ کے بجائے فیروزہ بیگم کو دیکھتے ہوئے بڑے ٹھر ٹھر کر کہا گیا جبکہ زُخرف ساکن سی اُسکو دیکھ رہی تھی جسکی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

"دستگیر!" یک دم فیروزہ بیگم تیزی سے اُٹھیں۔

"کیا ہو گیا ہے بھابھی، تحمل سے کام لیں۔" نگار بیگم نے تفکر سے کہا جبکہ مُصطفیٰ صاحب بڑے ہی غور سے اپنی بیگم کے انداز دیکھ رہے تھے۔

"تو نیہا نے ہمیں غلط کہا تھا؟" ردانے کہتے ہوئے صائم کو ٹھٹکا دیا۔

"غلط نہیں جھوٹ۔" کلانی پر بندھی گھڑی جھٹک کر مُختصراً کہا گیا۔ مُصطفیٰ صاحب نے زُخرف کی جانب دیکھا جو آنکھوں میں عجیب سا تاثر لیے اُنکے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

"تو تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟" کھڑا ہوتا دستگیر عروہ کے اس سوال پر وہیں جھکا رہ گیا۔ نگاہوں کا زاویہ بدل کر اُس نے اپنی جانب دیکھتے صائم کو دیکھا جو اُسکے دیکھتے ہی تیزی سے آگے کو ہوا اور پھر۔۔۔۔

"نہیں!...." کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے وہ سیدھا ہوا۔

"میں۔۔۔ کسی کو پسند نہیں کرتا۔" اپنے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے اُس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا جبکہ زُخرف اُسکو دیکھ رہی تھی جس نے یہ کہتے ہوئے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ اُس نے تنگ پڑتے دل سے نگاہیں پھیر لیں۔ فیروزہ بیگم اور ماریہ چچی نے جہاں سکون کا سانس لیا وہیں مُصطفیٰ صاحب چہرہ اٹھائے اپنے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ جو ماتھے پر بال گرائے، سیاہ شرٹ اور سیلور پینٹ میں ملبوس اُنکو بے حد سرد لگا۔ دل میں پھر سے خدشے سر اٹھانے لگے۔

"تم نے تو مجھے کہا تھا کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو۔" وہ جو تیزی سے یہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا، صائم کے کہے جانے پر گہرا سانس لے کر پلٹا۔ زُخرف نے گود میں رکھے ہاتھوں پر گرفت مضبوط کر لی۔

"کیا میں نے تمہیں ایسا ہی کہا تھا؟" عین صائم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے صائم کو ششدر کر دیا اور وہ اُس خاموشی کو نظر انداز کر کے تیزی سے ہال سے باہر نکل گیا۔ رِدا اور ثمن نے صائم کو دیکھا جو آنکھیں پھیلانے، گنگ سا وہیں دیکھ رہا تھا جہاں سے دستگیر کیا تھا۔

"جی تایا جان!" رات کا کھانا کھا کر وہ جیسے ہی اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگی، مُصطفیٰ صاحب کی کال آنے پر ٹھٹھک گئی۔ دوپہر میں ہی تو آج اُن کے ساتھ کھانا بھی کھایا تھا اور باتیں بھی کی تھیں۔ وہ ایک دن میں اُسکو اتنا نہیں بلاتے تھے تبھی اُسکا چونک جانا فطری تھا۔ اُنکو کہہ کر وہ واپسی کے لیے تیزی سے لکڑی کا دروازہ پار کر کے باہر نکل آئی۔ باہر رات اپنے پر پھیلانے ساکن تھی۔ گرمی کی رات میں آج جس کے بجائے ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ مُصطفیٰ صاحب کے گھر کے باہر کھڑے

ہوئے کر اُس نے لمحے بھر کو کچھ سوچا اور پھر سر جھٹک کر دروازے کھولے اندر آ گئی۔ ابھی رات کے دس بجے تھے اسی لیے کوئی نہیں سویا تھا۔

"تم کیا کر رہی ہو دوبارہ یہاں؟" وہ جو تایا جان کی لائبریری کی طرف جا رہی تھی، چونک کر پلٹی اور پیچھے فیروزہ بیگم کو کڑے تیوروں سے گھورتے پا کر گہرا سانس لیا۔

"تایا جان نے بلایا ہے۔" نگاہوں کا زاویہ بدل کر اُس نے بڑے ہی ضبط اور تحمل سے جواب دیا۔ سیڑھیاں اتر کر آتے دستگیر تک اُنکی نگاہ گئی اور وہ جو پہلے اُسکے منہ نہ لگنے کا سوچے بیٹھی تھیں، کچھ الگ سا ذہن میں کوندے کی مانند لپکا۔

"میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں تمہارے آج کل یہاں پھیرے کیوں لگ رہے ہیں۔" اُنکے کہے جانے نے زُخرف کا اطمینان رُخصت نہیں کیا۔

"کیوں لگ رہے ہیں؟" اُسکے سوال پر لمحے بھر کو اُنکا چہرہ سُرخ ہوا۔

"اگر تو تم میرے بیٹے کو پھانسنے۔۔۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتیں، زُخرف دو قدم اُنکے قریب آئی اور اُنکے چہرے کو دیکھا۔

"وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہے ورنہ میں آپکو بتاتی کہ مجھے اس خاندان اور اسکے مردوں میں ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔" اُسکے ٹھنڈے ٹھار انداز پر فیروزہ بیگم کا چہرہ طیش اور اہانت سے سُرخ پڑنے لگا مگر سب کچھ ایسا ہی جا رہا تھا جیسے وہ چاہتی تھیں۔ وہ زُخرف کی پشت پر دستگیر کو

ٹھہر ٹھہر کر سیڑھیاں اترتے دیکھ سکتیں تھیں اور اتنا دور بھی نہیں تھا کہ اُس تک زُخرف کے زیریں خیالات نہ پہنچتے۔

"پھر بھی اِس گھر کے مردوں کو اپنے آگے لگایا ہوا ہے تم نے۔۔۔۔۔" اَب کی بار وہ اپنا ضبط کھو کر قدرے اُونچی آواز میں بولیں اور دَسْگِیر سپاٹ چہرے کے ساتھ باقی ماندہ سیڑھیاں ایک جُست میں طے کر کے اُنکی سمت آیا۔

"اُمی۔۔۔۔۔" اِس سے پہلے کہ وہ جوابی کاروائی کرتی، عقب سے آتی اتنی اُونچی دھاڑ پر بے طرح چونک کر پلٹی۔ ٹی۔وی لاونج میں بیٹھیں وردہ اور ردہ ایک دوسرے کو دیکھ کر تیزی سے بھاگ کر باہر آئیں جبکہ زُخرف خاموش آنکھوں سے اُسکو دیکھ رہی تھی جسکا چہرہ برف سے زیادہ سفید اور پتھر سے زیادہ سخت محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے آپ سے اتنی گری ہوئی باتوں کی توقع نہیں تھی۔" زُخرف کے عین سامنے آکھڑے ہوتے ہوئے وہ اپنی ماں کو اتنا سخت کہہ رہا تھا۔ وہ جو بے حد نرم کہنا اور نرم بولنا جانتا تھا۔ اور زُخرف چہرہ اٹھائے اُسکی مضبوط، ڈھال جیسی پُشت دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈھال جو اُسکو آج دَرکار نہیں تھی۔

"تم۔۔۔۔۔ تم اِسکے لیے۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے۔۔۔۔۔" آنکھیں پھیلائے وہ دَسْگِیر کی آنکھوں میں اپنے لیے سختی دیکھ رہی تھیں۔

"نہ میں کچھ جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے آپ لوگوں کی باتیں جاننے میں کوئی دلچسپی ہے لیکن جب تک میں یہاں ہوں دوبارہ اِس طرح کی گری ہوئی باتیں نہ سُنوں۔۔۔۔۔" وہ اپنی ماں کو ٹوک کر سمجھا رہا تھا۔ جس نے آج تک بڑوں کی باتوں سے کبھی اختلاف نہیں کیا تھا۔

"تم اس کے لیے باہر گئے اور یہ۔۔۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتیں۔

"انف۔۔۔۔۔" وہ اس قدر اونچا دھاڑا کہ لائبریری میں بیٹھے مصطفیٰ صاحب تک ٹھٹک کر باہر بھاگ کر آئے جبکہ زُخرف ساکت ہوئے اُسکو دیکھ رہی تھی جسکا سُرخ نیم چہرہ واضح تھا۔

"ماضی کو دوبارہ میرے سامنے مت دوہرائیے گا ورنہ میں سارے ادب لحاظ بھول جاؤں گا۔" اُسکی مدہم آواز اتنی سرد تھی کہ فیروزہ بیگم کے ہاتھ شل سے پہلو میں آگرے۔ تیزی سے وہ جیسے ہی پلٹا، نگاہ عقب میں کھڑی زُخرف سے ٹکرائی جسکی آنکھوں میں اُسکے لیے اتنی حیرانگی اور ناپسندیدگی تھی کہ سر میں اٹھتی ٹھیسوں کو بامُشکل دبائے، باہر کی جانب نکل گیا۔ اس وقت اُسکا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ سیل فون نکال کر ارمان کو کال ملاتے ہوئے وہ سُرخ آنکھوں کے ساتھ، مین گیٹ کھول کر باہر نکل گیا جبکہ پیچھے سے خان بابا اُسکو آوازیں دیتے رہ گئے۔

"تایا جان۔۔۔۔۔" چہرہ پھیر کر وہ اُنکی جانب یوں بڑھی جیسے ابھی کچھ ہوا ہی نہ ہو جبکہ ساکن کھڑیں فیروزہ بیگم کو ملامت سے دیکھتے ہوئے وہ زُخرف کو آنے کا اشارہ کر کے واپس لائبریری کی جانب بڑھ گئے۔ فیروزہ بیگم کو دیکھے بغیر وہ مصطفیٰ صاحب کے پیچھے چلی گئی جبکہ وردہ اور ردا نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی ماں کو دیکھا جن کے قدم زمین نے گویا جھکڑ لیے تھے۔

"ایم سوری بیٹا! مجھے تمہیں بلانا نہیں چاہیے تھا۔" صوفی پر بیٹھتے ہوئے اُنہوں نے اندر آتی زُخرف سے کہا جسکے چہرے کے تاثرات سے وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔

"اس بات کو چھوڑیں اور مجھے سچ سچ بتائیں دو دن سے کیوں پریشان ہیں۔" اُنکے سامنے بیٹھتے ہوئے اُس نے بات ہی رفع دفع کر دی جبکہ وہ اُسے دیکھ کر رہ گئے۔

"پریشان تو نہیں بس کچھ بات کرنی تھی تم سے۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"کیسی بات؟" انکو تذبذب میں دیکھ کر حیرانگی ہوئی۔

"تم جانتی ہو نہ منصور کا تمہارا شوہر ہونے میں مجھے بڑا شک ہے۔" اگلی بار پر اُس نے سر اٹھا کر انکو دیکھا۔

"جانتی ہوں۔۔۔۔۔ اس گھر میں سب مان چکے سوائے آپ کے۔۔۔" چہرہ جھکا کر بتایا گیا۔

"آپ کیوں نہیں مانتے جبکہ میں آپکو خود بہت بار بتا چکی ہوں۔" اُسکا لہجہ بے حد مدہم تھا۔ مصطفیٰ صاحب ڈوبتے دل سے اُسکو دیکھے گئے۔

"میں بھی وہ سوچتا ہوں جو دستگیر نے مجھ سے کہا تھا۔" اُس بات پر زُخرف نے تیزی سے چہرہ اٹھاتے ہوئے انکو چونکا دیا۔

"وہ سہی کہتا ہے تم منصور جیسا شخص کسی قیمت پر منتخب نہیں کر سکتی۔" اس بات پر وہ انکو خاموشی سے دیکھے گئی۔ دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔

"مجھے کبھی نہیں لگا کہ تم اُسکے نکاح میں ہوں، اُسے پسند کرتی ہو۔۔۔ جانتی ہو کیوں۔۔۔؟" وہ یونہی کسی تاثر کے بغیر انکو دیکھے گئی۔

"کیونکہ جو پسند ہو اُس سے انسان یوں کتراتا اور گھبراتا نہیں ہے۔ اُس سے ملنے سے گریزاں نہیں ہوتا۔ اُسکے دیکھنے سے کراہیت محسوس نہیں کرتا۔" وہ بہت سوچ سوچ کر، ایک ایک منظر یاد کر کے کہہ رہے تھے، بتا رہے تھے۔

"تو پھر کب مجھے تم بتاؤ گی؟" اُنکے اگلے سوال پر اُس نے گہری سانس لی۔

"کیا؟" وہ جان کر بھی انجان بن رہی تھی

"کہ منصور تمہارا شوہر نہیں ہے۔" اُن الفاظ پر زُخرف اُنکو کتنے ہی لمحے خاموشی سے دیکھے گئی۔ کیا وہ اُن کو سب کچھ سچ بتا دینے کی ہمت رکھتی تھی؟ وہ سب جو آج بھی اول روز کی طرح اُسکی سوچوں اور دل پر نقش تھا۔ کیا وہ سب پھر سے دوہرانا آسان تھا؟

"ایسا کچھ نہیں ہے تایا جان، آپ ایسی سوچوں سے ہی خود کو بیمار کر لیتے ہیں۔" نرمی سے کہہ کر اُس نے اُن کی پریشانی رفع کرنی چاہی مگر جانتی نہیں تھی کہ اُن کے خدشات کسی اژدھے کا رُوپ دھارے اُنکے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔

"تو کیا وہ واقعی تمہارا شوہر ہے؟" اُنکے اگلے سوال پر اُسکو سارے جواب گم ہوتے محسوس ہونے لگے۔

"میں سب ٹھیک کر دوں گی تایا جان۔ آپ بس اپنی صحت پر دھیان دیں۔" جواب وہ نہیں تھا جو وہ سُنانا چاہ رہے تھے بہت کچھ جاننے کے باوجود۔ وہ اُسکو یونہی دیکھے گئے اور اللہ کا کرم تھا کہ اُسکا سیل فون بج اُٹھا۔ جلتی بجھتی سکرین پر منصور کا نام دیکھ کر پہلی بار اُسکو شدید کوفت نہیں ہوئی تھی۔

"منصور کی کال ہے۔" دھیرے سے مُسکرا کر وہ فون تھامے، تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر مُصطفیٰ حیدر صاحب چہرے پر ڈھیروں تفکر لیئے اُسکو جاتے دیکھ رہے تھے جس نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اصل جواب نہیں دیا تھا، جو آج بھی اُن کو کچھ بھی بتانے پر راضی نہیں تھی۔

"کیا بات ہے آج کوئی سخت جملہ سُننے کو نہیں مل رہا۔" وہ جو خاموشی سے کال اٹھا کر مُصطفیٰ صاحب کے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ دوسری جانب منصور کی آواز نے اُسکو چونکا دیا۔

"تمہاری حالت اب کیسی ہے؟" منصور نے فریکچر ہاتھ کو ایک نظر دیکھ کر فون کال سے ہٹایا۔ یقین دہانی کی کہ اُس نے زُخرف کو ہی کال کی ہے۔

"تم نے بددعائیں تو بہت دی ہوں گی مگر میں بہتر ہو رہا ہوں۔" وہ اُسکی جانب سے کوئی مزید جلا کٹا جملہ سُننے کا متمنی تھا مگر زُخرف کا ذہن کسی اور جانب سوچ رہا تھا۔

"تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" گردن پر جلن سی محسوس ہونے لگی تھی مگر اُس نے دل پر پاؤں رکھ کر کہہ ہی دیا۔

"زہے نصیب، کہیے۔۔۔" دوسری جانب اُسکی بدلتی ٹون پر زُخرف نے آنکھیں موند کر چہرہ آسمان کی جانب اٹھا لیا۔ لمحے بعد آنکھیں کھولیں تو تاروں بھرا آسمان اُسکی آنکھوں کے سامنے تھا۔

"میں کل ہاسپٹل آؤں گی۔۔۔" کہہ کر اُس نے کال مُنقطع کر دی۔ اس سے زیادہ وہ اس شخص کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ فون ہاتھ میں لیئے وہ وہیں لان میں کھڑی، سر اٹھائے سیاہ آسمان کو دیکھ رہی تھی اور کانوں میں مُصطفیٰ صاحب کی کہی باتیں گونج رہی تھیں۔

"دستگیر ایسا کہتا ہے منصور کے بارے میں، دستگیر کو یوں لگتا ہے کہ تمہارا انتخاب ایسا نہیں۔۔۔ دستگیر کہتا ہے ہم سب نے تمہارا حق ادا نہیں کیا۔۔۔ ہم سب نے تم سے کچھ نہیں پوچھا۔۔۔" چہرہ جھکا کر

اُس نے اُن سب خیالات کو جھٹکا اور پھر ایک نئی سوچ ذہن میں آئی۔۔۔ اب دستگیر مصطفیٰ کی خیر نہیں تھی۔

"یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟" اندر آتے ارمان نے اُسکو چونکا دیا جیسی کھڑکی کی جانب کی گئی چیئر کا رخ اُس سمت کیا گیا جہاں سے ارمان نظر آ رہا تھا۔

"نہ سلام نہ دُعا ڈائریکٹ ہی فار۔۔۔" اُسکے انداز کی بے پرواہی پر ارمان نے دانت کچکچائے۔

"میرے سامنے یہ لاعلم ہونے کی ایکٹنگ مت کیا کرو تم، کتنی بار سمجھا چکا ہوں۔" ارمان کے سخت لہجے کو پھر سے گھاس نہیں ڈالی گئی۔

"لیکن ہوا کیا ہے، کچھ معلوم تو ہو۔" کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے اُس کے لہجے پر لمحے بھر کو ارمان ٹھٹکا۔ کم بخت ایسے لاعلم محسوس کرواتا تھا کہ اگلا بندہ اپنی کہی بات پر خود ہی شرمندہ ہو جائے مگر سامنے ارمان تھا، اُسکی رگ رگ سے واقف۔

"وہ تم ہی تھے نہ جس نے منصور پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُسکو ہاسپٹل پہنچا دیا ہے۔" اُسکی کہی گئی بات پر دستگیر نے چہرہ پھیر لیا۔

"نہ تم انکار کر رہے ہو اس بات سے اور تم تو شرمندہ بھی نظر نہیں آ رہے مجھے۔" تیزی سے اُسکے آگے آتے ارمان کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا رہی تھی۔

"میں شرمندہ کیوں نظر آؤں گا۔" اُس بات پر ارمان کا ضبط رُخصت ہونے لگا۔

"سچ سچ بتاؤ مجھے دستگیر اُس دن تمہاری وہ کزن آفس سے اتنے برے حال میں کیوں باہر بھاگی تھی؟" اگلے کڑے سوال پر دستگیر نے ارمان کے چہرے کو دیکھا جہاں پریشانی اور سختی تھی۔

"کیا، تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔۔۔؟" وہ دستگیر ہی کیا جو کسی کے دباؤ میں آ جائے۔

"دوائیاں لے رہے ہو اپنی؟" گہرا سانس لے کر پیچھے کو ہوتے ہوئے پوچھا گیا۔ دستگیر نے آہستگی سے سر اثبات میں ہلایا مگر ارمان کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"ازبلا سے رات کی ڈرائیونگ کا کیوں پوچھ رہے تھے تم؟" ایک اور سوال حاضر تھا۔

"تم دونوں بہن بھائیوں کے پیٹ میں کوئی بات نہیں ٹھہرتی۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ پیچھے ٹیبل سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"تم میرے کسی ایک ہی سوال کا جواب انسانوں کی طرح دے سکتے ہو؟" پھر سے سوال۔

"نہیں۔۔۔" بڑے ہی اطمینان سے اب کی بار جواب آیا۔ بالوں میں ہاتھ پھیر کر ارمان کچھ قدم پیچھے ہوا اور گلاس وال کا سہارا لے کر اپنے دوست کے اطمینان کو دیکھ رہا تھا۔

"دوبارہ تمہیں میں منصور کے معاملے میں پڑتے نہیں دیکھنا چاہتا دستگیر۔۔۔" لہجے میں تفکر اور پریشانی تھی۔ دستگیر نے چہرہ اٹھا کر اُسکو دیکھا جو ملال سے اُسکو دیکھ رہا تھا۔

"میں بس اُسکو ایکسپوز کرنا چاہتا ہوں۔" چہرہ جھکا کر بے حد مدہم سا بتایا اور ارمان اُسکو دیکھ کر رہ گیا۔

"کیا ایکسپوز۔۔۔ ہو سکتا ہے سب تمہاری غلط فہمیاں ہوں، ہو سکتا ہے تمہیں یقین نہیں آ رہا ہو کہ

زُخرف تمہیں رد کر کے منصور جیسے کسی شخص کا انتخاب کر سکتی ہے۔۔۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو

مجھے بتاؤ تمہاری کزن سات سال سے خاموش کیوں ہے، کیوں کسی کو سچ نہیں بتاتی، کیوں ہر بار منصور کے تعارف پر کچھ نہیں کہتی۔۔۔" وہ تو جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ دستگیر نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ یہی سب باتیں تو اُسکی نیند حرام کیئے ہوئے تھیں۔

"یہی بات مجھے سمجھ نہیں آتی لیکن مجھے ایک بات کا یقین ہے۔" اُسکے عظم پر ارمان ٹیک چھوڑ کر سیدھا ہوا۔

"کس بات کا؟" جواب اُسکو معلوم تھا مگر پھر بھی۔۔۔۔

"کہ زُخرف نے منصور چوہدری سے نکاح نہیں کیا۔" اُسکی سوئی ایک ہی بات پر اڑ گئی تھی۔
"تو سب جھوٹ کہتے ہیں؟" ارمان کو اُسکا اتنا بختہ یقین حیران کر رہا تھا۔

"ہاں سب جھوٹ کہتے ہیں یا سب حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔" اُسکی سوچتی نظریں گلاس کھڑکی سے باہر نظر آتے سبز زار پر جمی ہوئی تھیں۔

"فرض کرو تم اُسے ایکسپوز کر دیتے ہو پھر؟" دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے ارمان کا انداز بڑا سیدھا اور صاف تھا۔

"مطلب۔۔۔" زُخرف کے معاملے میں اُسکو سامنے کی آسان اور صاف بات بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔

"پھر کیا کرو گے، زُخرف سے شادی تمہارا اگلا سٹیپ ہے کیا؟؟" ارمان واقف تھا اپنے سوال کی سختی سے مگر دستگیر کا دماغ دُرست کرنا ضروری تھا اور اس سوال کر دستگیر مُصطفیٰ سُن رہ گیا۔

"تم ایسی بات کر بھی کیسے ہو؟" وہ حقیقتاً حیران ہوا۔

"جیسے تم اُسکو ایکسپوز کرنے کے لیے سِر دھڑ کی بازی لگا رہے ہو میں کیا کوئی بھی تم سے یہ سوال کر سکتا ہے۔" وضاحت پر وہ چہرہ پھر سے باہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی اور سبزہ زار کی جانب کر چکا تھا۔

"باقی سب کچھ نہیں جانتے مگر تم جانتے ہو۔" ارمان اُسکو مایوسی سے دیکھتا رہا۔

"دیکھ میرے یار! یہ وقت ایسا ہے کہ تمہیں دوسروں کے بجائے اپنی فکر کرنی چاہیے۔" فولڈ ہوئے بازو پہلو میں گراتے ہوئے اب وہ اخلاص سے سمجھا رہا تھا۔

"جانتا ہوں۔" اُسکے مدہم انداز پر ارمان کو سمجھ نہیں آئی کہ مزید اُسکو ایسا کیا کہے جس سے وہ سمجھ جائے۔

"اب قاسم کا کیا معاملہ ہے؟" یاد آ جانے پر اُس نے اچانک کہا۔ دستگیر بھی چونک کر سیدھا ہوا۔

"کیلون نے بتا دیا۔" وہ جیسے اُسکے خبر رساں کو خوب جانتا تھا مگر سامنے بھی ارمان تھا۔

"اُس شخص کی تلاش میں تم نے پورا نیٹ ورک ہلا دیا ہے تو کیسے مجھے خبر نہیں ہو گی۔" دستگیر نے گہرا سانس لیا۔

"اپنی بہن کے کانوں تک اگر یہ بات پہنچائی تو خیر نہیں ہے۔" ایک دم اُسکے کڑے انداز پر ارمان اُلٹے قدموں اُسکی رسائی سے دور ہوا لیکن دستگیر کی ہنوز کڑی نگاہیں خود پر محسوس کر کے اُس نے مفاہمتی انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔

"قسم سے نہیں بتاؤں گا۔" شہ رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے یقین دلایا مگر دستگیر اُسکے وعدوں اور قسموں سے خوب واقف تھا۔

"کوہاٹ سے دور ایک قصبہ ہے وہاں آپکو یہ قاسم نامی شخص گم نامی کی زندگی گزارتے ہوئے ملے گا۔" میسج پر پیغام پڑتے ہوئے اُس نے تیزی سے فون رکھا اور پھر ریک پر موجود کتاب کو لیور کی طرح نیچے کر کے درزوں سے جھانکتی لائبریری میں آگیا۔

چند لمحے وہ وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر۔۔۔ نیچے جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ لائبریری کے اندر نیچے ایک بیسمنٹ مزید تھا۔ نیچے اتر کر اُس نے اندازے سے دیوار پر ہاتھ مارتے ہوئے ساری روشنی جلا دی اور آگے بڑھا۔ وہ بیسمنٹ پھر بھی اندھیرے میں تھا صرف درمیان میں رکھے ایک طویل ٹیبل کے عین اوپر لٹکتے بلب کی روشنی تھی جو بیسمنٹ کو روشن کرنے میں ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔

ٹیبل کی جانب آتے ہوئے اُس نے جیب سے رول کیا ہوا نقشہ نکالا اور پھر ٹیبل پر پھیلا دیا۔ کوہاٹ کے بتائے گئے قصبے پر سُرخ مارکر سے نشان لگاتے ہوئے نیم روشنی میں کھڑے اُس شخص کے تاثرات کا اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا۔

"احمد دُرانی جیسے بزنس مین کا قاسم جیسے انسان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" وہ چھوٹا سا نقشہ اٹھا کر سامنے دیوار پر نصب شیشے پر لگانے لگا جہاں پہلے ہی نہ جانے کس کس کی معلومات درج تھیں۔ اُن معلومات پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اُسکی نگاہ احمد دُرانی کی کال لاگ کے صفحے پر آ کر ٹھہر گئی جہاں بہت سے نمبر درج تھے۔ صرف ایک نمبر جسے وہ جانتا تھا جس پر پیلا ہائی لائٹر پھیرا گیا تھا۔

"احمد دُرانی اور زُخرف کا کیا لنک ہو سکتا ہے؟" اُس نمبر پر انگلی پھیرتے ہوئے ایک اور سوال اٹھا رہا تھا۔ چونکہ اُس نے تیزی سے اُس نقشے کو دیکھا جہاں قاسم نامی شخص کی موجودگی متوقع تھی۔

"اگر احمد دُرانی صاحب قاسم نامی شخص کو زُخرف کے کہنے پر تلاش کر رہے ہوں" اوپر چسپاں احمد دُرانی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ بیسمنٹ میں اُسکی آواز دھمک پیدا کر رہی تھی۔ "تو زُخرف کیسے جانتی ہے قاسم کو؟" یہ سوال تھا جسکے جواب کے لیے اُسے کوہاٹ جانا ہی تھا۔ کونے میں ایک کرسی پر پڑے سیاہ پیک بیگ کو اٹھا کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ تیزی سے بیسمنٹ کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں جاتے ہوئے مختلف کیبنٹ اور ریک سے چیزوں کو ٹیبل پر رکھتا جا رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے ہاتھ میں "knuckles" پہنتے ہوئے اُس تمام سامان پر نظر ڈالی جو اُسے کوہاٹ اور قاسم کے اسلام آباد کے گھر کی تلاشی لیتے وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ جدید اسلحے کے علاوہ خنجر، انجیکشنز، الیکٹریکل گن، مختلف ڈیجیٹل لاک کھولنے والی چھوٹی سی مشین اور پاور فل ٹارچ۔ وہ آپریشن پر جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ دیوار پر ہاتھ مارتے ہوئے اُس نے وہ مدہم سا چلتا بلب بھی بھجوا دیا۔ اب بیسمنٹ میں گھپ اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں قدم قدم چلتا اندازے سے ٹیبل تک گیا اور پھر پیک بیگ اٹھا کر کندھے پر پہن لیا۔ ایک ہاتھ دیوار پر رکھتے ہوئے وہ تیز قدموں سے واپس لائبریری سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

"گاڑی بیک ڈور پر کھڑی کرنا۔" علی کو کال ملا کر کہتے ہوئے اُس نے گھڑی پر ٹائم دیکھا جہاں رات کے بارہ بج رہے تھے اور پھر کمرے سے باہر آ کر اُس نے مدہم چلتی روشنیوں سے نگاہ چُرا کر دیوار ٹٹولی اور پھر وہ لکڑی کے آبنوسی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ باہر کی روشنیوں نے اُسکی آنکھوں کو پھر سے باہر دیکھنے کے قابل کر دیا۔ ملک ہاؤس کی تمام بتیاں ہمیشہ کی طرح پورے ملک ہاؤس کو منور

کیئے ہوئے تھیں۔ بے آواز قدموں کے ساتھ وہ عقبی حصے کی طرف آیا اور پھر عقبی حصے کی دیوار دیکھ کر تیزی سے بھاگتے ہوئے اس سے پہلے کہ وہ دیوار پھلانگتا۔۔۔

"ج۔۔۔۔۔ چور۔۔۔۔۔" مدہم، سرسراتی آواز پر اُسکے بھاگتے قدم تھمے۔ چہرہ پھیر کر وہاں دیکھا جہاں روشنیوں میں اُسی جھولے پر وہی شل سی بیٹھی اُسکی جانب دنگ ہو کر دیکھ رہی تھی۔ پی۔ کیپ نیچے کرتے ہوئے وہ ایک ہی جست میں اُس تک پہنچا جو زور سے چیخی اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ چیختی، بجلی کی سی رفتار سے اُسکے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اُسکا سر اتنی عُجلت میں بھی نرمی سے جھولے کی پشت پر ٹکا گیا۔

چہرہ جھکا کر اُس نے اُن ششدر، پھیلتی سُنبھری آنکھوں کو دیکھا اور لمحے بھر کے لیے اُسکی سانس ساکن ہو گئی۔ اُن سُنبھری آنکھوں میں جھلک آتی نہی اُسکو پھر سے اپنی جانب مائل کر چکی تھی۔ اُسی کو جس نے رُکنے کا، مسحور نہ ہونے کا خود سے عہد کر لیا تھا۔

"اُو۔۔۔۔۔" بُری طرح سر جھٹکتے ہوئے اُسکو چونکا دیا گیا۔ اُسکی نگاہ اپنے ہاتھوں میں سختی سے قید اُن دودھیاء، سُنبھری ہاتھوں تک گئی اور پھر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا۔

"ج۔۔۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ بھاگ کر اُسکے برابر سے نکلتی، ہوش میں آ کر اُسکو کہنی سے تھام کر ایک جھٹکے سے اپنے سامنے کیا جو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُسکے عین سامنے آتے ہی بائیں ہاتھ سے سر پر موجود پی۔ کیپ اتار کر روشنی میں وہ اُن پھیلتی، بھیگتی آنکھوں کو سُکڑتے دیکھ کر رہ گیا۔

"ایم سوری۔۔۔" کہہ کر اُس نے سر جھکایا اور سامنے بے یقین سی زُخرف نے سیاہ پینٹ شرٹ پہ، سیاہ پی-کیپ پہنے، سیاہ بیگ کندھے پر لٹکائے شخص کو سر تا پا دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اپنی کہنی یوں چھڑائی جیسے وہ کوئی عفریت ہو۔ سر جھکا کر کھڑے دستگیر نے اُسکا ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھوں سے نکل جانے دیا۔ نگاہوں کا زاویہ بدلنے کے ساتھ وہ تیزی سے اندر جانے کے لیے آگے بڑھ گئی اور دستگیر مصطفیٰ وہیں کھڑا اُسکے لرزتے مگر مضبوط قدم دیکھ رہا تھا۔ اُسکو اپنی حرکت پر ایک بار پھر ندامت گھیرنے لگی۔ سر جھٹک کر اُس نے کچھ قدم دور دیوار کو دیکھا۔ جاتی ہوئی زُخرف نے لمحے بھر کو پلٹ کر دیکھا اور وہیں تھم گئی۔ وہ شخص جو آنکھ جھپکتے اتنی اونچی ملکِ ہاؤس کی بجلی کی تاروں میں لپٹی دیوار پھلانگ گیا تھا، کیا وہ دستگیر مصطفیٰ حیدر ہی تھا؟؟؟؟

صبح وہ جس وقت گھر میں داخل ہوا، شاید ناشتے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دبے قدموں سیڑھیوں کی جانب بڑھتے ہوئے اُسکو ٹھہر جانا پڑا۔ چہرہ پھیر کر اُس نے لائبریری سے نکلتے مصطفیٰ صاحب کو دیکھا جو حیرانگی سے اُسکو دیکھ رہے تھے۔ کیا وہ اس وقت گھر آ رہا تھا؟

"واک پر گیا تھا۔" اُنکی آنکھوں میں اُترتے تفکر کو دیکھ کر کہنا پڑا۔ وہ بیگ گاڑی میں چھوڑ آیا تھا اور کپڑے پیڑول پمپ پر چینج کر لیے تھے۔ اُنہوں نے اُسکے سیاہ ٹریک سوٹ کو دیکھ کر گہری سانس لی۔ "اسلام و علیکم!" اُنکو یونہی اپنی جانب دیکھتے پا کر اُسکو کہنا ہی پڑا۔ وہ اُسکو ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے؟؟

"میں کپڑے چینج کر کے آتا ہوں۔" اُنکا جواب نہ پا کر وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا اُنکی نظروں سے اوجھل ہو گیا مگر وہ یونہی چہرہ اٹھا کر اُسکو دیکھے گئے۔ ذہن میں مختلف وہم آرہے تھے مگر سر جھٹک کر وہ ہال میں چلے گئے جہاں سب ناشتہ لگنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"ردا! جا کر زری کو بلاؤ ناشتہ کے لیے۔" اُنکے کہے جانے پر ردا تو مسکراتے ہوئے تیزی سے باہر کی جانب گئی۔ ساری عورتیں کچن میں مصروف تھیں ملازموں کے ساتھ ورنہ فیروزہ بیگم کی شکل دیکھنے والی ہوتی۔ کچھ دیر بعد ہی ردا اُسکا ہاتھ تھام کر لاتی ہوئی نظر آئی۔ صاف معلوم تھا کہ وہ آنا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

"اسلام و علیکم!" سب کو مشترکہ سلام کر کے وہ تایا جان کی جانب آئی، اُنکا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ اُنکے برابر ہی بیٹھ گئی۔

"آپکو معلوم ہے مجھے ناشتہ آفس میں کرنے کی عادت ہے۔" آہستگی سے کہا گیا۔ اتنا کہ صرف مصطفیٰ صاحب نے چہرہ پھیر کر اُسکو مسکرا کر دیکھا۔

"اور یہ عادت بالکل اچھی نہیں ہے۔" اُنہوں نے بھی سرگوشی کی۔ سیف صاحب سے باتوں میں مشغول مرتضیٰ صاحب کی نگاہ غیر اراداً اُن تک گئی اور ٹھہر گئی۔ وہ دونوں دُنیا جہان سے بے خبر سرگوشیوں میں بات کرتے ہوئے مسکرائے جا رہے تھے۔ پہلی نظر میں دیکھنے والا شخص اُنکو باپ اور بیٹی ہی سمجھتا۔ کہیں اندر اُنکے دل اور سوئے ہوئے ضمیر نے کروٹ بدلی۔

"اسلام و علیکم!" آواز پر زُخرف کی نگاہ سرسری سی دروازے تک گئی جہاں سے سیاہ قمیض شلوار میں ملبوس شخص خوشبوئیں لٹاتا داخل ہو رہا تھا۔ اُس نے تیزی سے نگاہیں پھیر لیں۔

"وعلیکم اسلام۔۔۔۔۔" سب نے بیک وقت سلام کیا۔ چونکہ آج ہفتہ تھا اور ہفتہ، اتوار سب ضروری کام نہ ہونے کی صورت میں عموماً گھر ہی ہوتے تھے۔

"آپ کو لگتا ہے کالا رنگ بہت پسند ہے۔" زینی کے کہے جانے پر وہ جو صائم کے اٹھے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بیٹھ گیا تھا، مسکرا دیا۔

"اچھا! ہو سکتا ہے۔" اُسکے یوں کہے جانے پر وردہ اور فروہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں چھاڑ کر بیٹھی رہیں کہ کل کی بے عزتی زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔

"آپ بلیک کپڑے ہی کیوں پہنتے ہیں زیادہ تر؟" زینی کے بجائے سبیل نے مزے سے کہا۔ دستگیر کو یہاں آئے مہینہ ہونے کو آیا تھا لیکن سب اُسکے مزاج اور عادات کی بدلتی لہ سے ابھی تک واقف نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ اپنی سمت باتوں کا رخ موڑنے ہی نہیں دیتا۔

"اس سے زیادہ کوئی گہرا رنگ ہوا تو وہ پہن لیں گے۔" پاس بیٹھے سبیل کے بالوں میں اُس نے بے اختیاری میں ویسے ہی ہاتھ چلایا جیسے زُخرف چلاتی ہے اور حیرت کی بات یہ تھی آج سبیل ہمیشہ کی طرح چیخا نہیں۔

"آپ بھی تو اپنے ماتھے پر گرائے بال پیچھے کیا کریں۔ ایسے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔" سبیل کے کہے جانے پر اُسکی مسکراہٹ تیزی سے سمٹی۔ ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے وہ پھر سے سیدھا ہو بیٹھا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" خاموشی محسوس کر اُسکو مسکرانا پڑا۔

"پہلے آپ کے بال پیچھے ہوتے تھے نہ۔" زینی نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

"اتنے زمانوں پرانی بات۔۔۔" زُخرف کی نگاہ اُس تک گئی جسکی آنکھوں میں وہ کوئی بہت خاموش سا تاثر اُترتے دیکھ رہی تھی۔

"رات کیا ہوا تھا زری۔۔۔ تمہاری چیخ سنی میں نے ٹیسٹ یاد کرتے ہوئے۔" عروہ کے کہے جانے پر زُخرف نے چونک کر اُسکو دیکھا۔ دستگیر کی نگاہ زُخرف تک گئی جو اپنے دونوں ہاتھ بے دردی سے مَسَل رہی تھی۔

"ک۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ کالی بلی تھی شاید اس لیے۔" چہرہ جھکا کر اُس نے اپنی آواز حتی الامکان نارمل رکھی جبکہ مُصطفیٰ صاحب نے ٹھٹک کر اپنے بیٹے کو دیکھا جسکی بے چین نگاہیں زُخرف پر ہی تھیں۔ وہ پھر سے چونک گئے۔ وہ اپنے بیٹے کو ہر بار دیکھ کر نہ جانے کیوں چونکنے لگے تھے۔

"تم تو بالکل ہی آفس میں مصروف ہو گئے ہو۔" اُسکی نظریں زُخرف پر ساکن دیکھ کر صائم نے آگے ہو کر اُسکا شانہ ہلایا۔ بنا چونکے اُس نے چہرہ پھیر کر صائم کو دیکھا جو اُسکو ہی دیکھ رہا تھا بغور اور صائم وہ ساکن رہ گیا۔۔۔ دستگیر نے واقعی اُسے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہے۔ اُنکے درمیان تو مُجت کی بات ہوئی تھی، کسی کو دیکھ کر دل دھڑک اُٹھنے کی بات۔۔۔ تو کیا وہ ابھی تک؟؟؟

"یہاں سیٹل کرنا ہے سب تو پریش تو ہو گا۔" اُس نے آہستگی سے کہا۔

"ناشتہ تیار ہے۔" نگار بیگم کے کہے جانے پر سب چونک کر اُٹھے اور پھر ڈائیننگ روم کی جانب بڑھ گئے۔ زُخرف نے آگے بڑھ کر مُصطفیٰ صاحب کے لیے کسی معمول کی طرح کرسی پیچھے کی اور وہ اُسکا سر تھپتھپا کر بیٹھ گئے۔

"یہ میرا اس ٹیبل پر آخری ناشتہ ہے۔" کرسی دھکیل کر اُس نے پھر سے سرگوشی کی اور مُصطفیٰ صاحب مُسکرا کر سر ہلانے لگے جانتے تھے کہ زُخرف اُنکو کبھی، کسی بات کے لیے انکار نہیں کر سکتی۔۔۔

"بابا جان! مجھے کل ایبٹ آباد جانا ہے۔" دستگیر کے کہے جانے پر فیروزہ بیگم نے تیزی سے چہرہ اٹھا کر اُسکو دیکھا جو اُنکو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اُنکا فرما بردار بیٹا جو اُن سے ہر کام میں رائے لیتا تھا وہ اُنکو دیکھ تک نہیں رہا تھا۔

"گھومنے۔۔۔" سبیل نے چہک کر کہا۔

"نہیں، ضروری کام سے۔" مُسکرا کر بتایا جبکہ سبیل کا چہرہ بُھج گیا۔

"مجھے گھومنے کا شوق نہیں لیکن تم سب کے ساتھ جاؤں گا واپس آ کر۔" اُسکی اگلی بات پر زینی، سبیل، عروہ، فروہ، رِدا، وردہ، ثمن اور صائم نے خوشی کے بے پایاں احساس سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سب عورتوں کو یقین ہو گیا کہ اب یہ گھومنے پھرنے کی ہانک آج سے ہی شروع کر دیں گے۔ دستگیر نے کن آنکھوں سے اُسکو دیکھا جو غیر دلچسپی سے اُسکی باتوں سے لا تعلق بیٹھی تھی۔ اُسکا دل رُکنے لگا اور وہ نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔

"ہاں! سب ضرور جاؤ۔۔۔ اور دستگیر کو دکھانا پاکستان اُسکی غیر موجودگی میں کتنا خوبصورت ہو گیا ہے۔" مُرتضیٰ صاحب کے کہے جانے پر سب ہی مُسکرا دیئے سوائے دستگیر، مُصطفیٰ صاحب اور زُخرف کے۔

"کتنے دن کے لیے جانا ہے ایٹ آباد؟" مصطفیٰ صاحب کے سوال پر مرتضیٰ صاحب کی مسکراہٹ سمٹی۔

"ایک ہی دن کے لیے۔ کام ہو گیا تو اُسی رات واپسی۔" اُسکے بتائے جانے پر ٹرپ پر جانے کے پلان بناتی پارٹی نے ایک دوسرے کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

"آپ بھی چلیں گی نہ آپ؟" زُخرف کو یوں خاموشی سے ناشتہ کرتے دیکھ کر سبیل نے ایک آس سے پوچھا جبکہ ماریہ بیگم کا دل چاہ رہا تھا اُس بہن کے چچے کو ایک کس کر تھپڑ جھڑ دیں۔

"میرا کیا کام۔" مسکرا کر سبیل کو کہا مگر دستگیر کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔

"سب مل کر پاکستان دیکھیں گے نہ۔" زینی نے بھی اس عرصہ میں اپنا حصہ ڈالنا چاہا۔

"میں اپنے کام کی وجہ سے اس ملک کا ایک ایک کونا جانتی ہوں، بیٹا۔" اُسکے کہے جانے پر سبیل اور زینی کا چہرہ اُتر گیا۔ اس سے پہلے کہ مصطفیٰ صاحب کچھ کہتے۔۔۔

"گائیڈ کی صورت چلیے گا سب کے ساتھ۔" یہ اصرار وہاں سے آیا جہاں سے آنے کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ ناشتے سے ہاتھ روک کر سب دستگیر کو دیکھنے لگے جو ناشتے کی پلیٹ پر جھکی زُخرف کو دیکھ رہا تھا۔ ماریہ اور فیروزہ بیگم نے ایک دوسرے کو آنکھوں میں ڈھیروں خدشے لیے دیکھا صرف وہاں مصطفیٰ صاحب تھے جن کا دل ٹھنڈا ہونے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے دستی بیٹا۔۔۔" اُسکی ساکن خاموشی اور جواب نہ دینے پر مصطفیٰ صاحب کو کہنا ہی پڑا کیونکہ دستگیر کا مایوس ہو کر بھجتا چہرہ اُن سے دیکھا نہیں گیا تھا۔

"میں چلتی تیا جان۔۔۔ لیکن آپ کو معلوم ہے نہ عباد پر سارا کام کا بوجھ مزید نہیں ڈال سکتی۔" واحد مصطفیٰ صاحب تھے جن کی باز پُرسی پر، اصرار پر اُسکو بڑا واضح جواب دینا ہوتا تھا۔

"لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ زری میری بات نہیں ٹال سکتی۔" تیا جان کے مسکراتے انداز پر اُسکا دل اندر ہی اندر ساکن ہونے لگا۔ وہ یونہی اُنکے خوشی سے مسکراتے، پُر اُمید چہرے کو دیکھے گئی۔

"اور اسی بات کا فائدہ اُٹھاتے ہیں آپ۔" اُسکے نروٹھے لہجے پر مصطفیٰ صاحب کے قہقہے نے سب کو حیران کر دیا۔ وہ زمانوں بعد اُنکو یوں خوشگواریت سے ہنستا دیکھ رہے تھے۔ دستگیر نے اُسکو دیکھا جو ہر شے سے غافل اُسکے باپ کو دیکھے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں ڈھیروں مُجت، احترام اور اپنائیت کے سوا کچھ اور بھی تھا۔ زُخرف نے نگاہ اُٹھا کر سامنے دیکھا اور دستگیر مصطفیٰ نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔

"اچھا جب وقت آئے گا تب دیکھتے ہیں۔" اُنکے ہاتھ پر بے حد اپنائیت سے ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے آہستگی سے کہا۔ یہ طے تھا کہ اُسکی ذات کے سارے اختیارات اُس نے مصطفیٰ تیا کو سونپ دیئے تھے۔ وہ اُسکے لیئے تیا اور باپ سے بڑھ کر بھی کچھ تھے جسے لفظوں میں بتایا نہیں جاسکتا تھا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا جانے کا؟" فیروزہ بیگم کے کہے جانے پر اُس نے خاموشی سے چہرہ پھیر کر اُنکو دیکھا جو اُسکی ماں تھیں۔

"آب بتا تو دیا ہے، امی۔" ناشتے سے ہاتھ کھینچ کر اُس نے آہستگی سے کہا۔ وہ مزید لہجہ بدل کر ان سب کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"لیکن جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" کل نیہا نے آنا تھا اور وہ اُسے روک لینا چاہتی تھیں۔

"میں کون سا زندگی بھر کے لیے جا رہا ہوں۔" ثشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُس نے سادگی سے کہا جبکہ فیروزہ بیگم کے دل ہر ہاتھ ہڑا۔

"دیکھ رہے ہیں مُصطفیٰ کیسے پھر میرا دل جلا رہا ہے۔" اُنکی بھگتی آواز پر دِستگیر نے گہرا سانس لیا۔

"ایک دِن کے لیے جا رہا ہوں، شاید کل رات ہی واپس آ جاؤں۔" اُسکو اُسی نرمی سے کہنا پڑا جو اُسکا کبھی خاصہ تھی۔ مُصطفیٰ صاحب نے بغور اُسکو دیکھا جو کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم کہاں؟" سوال اَب کی بار سیف چچا کی جانب سے آیا۔

"دوپہر تک آ جاؤں گا۔" سیف چچا کو کہتے ہوئے اُس نے دیکھا اپنی ماں کی جانب تھا۔ بتایا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ تبھی زُخرف کا سیل فون بج اُٹھا۔

"میں بس نکلنے لگی ہوں۔" کہہ کر اُس نے تیزی سے کال کاٹی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تایا جان! دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار مت کیجیے گا۔" نرمی سے اُنکے شانے پر ہاتھ رکھ کر وہ ہاتھ میں انگلی میں لپٹے کی۔ چین پر گاڑی کی چابی کی تصدیق کر کے باقی سب پر نگاہ ڈالے بغیر تیزی سے باہر کی جانب بڑھی۔

"اللہ حافظ آپی!" سبیل کی آواز پر وہ ٹھٹکی مگر چہرہ نہیں پھیرا۔

"اللہ حافظ۔۔" نرمی سے کہہ کر وہ ڈائینگ ہال کا خارجی دروازہ پار کر گئی۔

"میں چلتا ہوں، اللہ حافظ" بابا جان کو دیکھ کر وہ مُسکراہٹ اور پھر اُسکو بھی منظر سے جاتے دیکھ کر ماریہ بیگم کو نئے تفکر نے گھیر لیا۔ جیسے ہی وہ باہر لان میں آیا، سیاہ گاڑی دروازے کے پاس کھڑی

دیکھ کر ٹھٹکا جسکے ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی زُخْرُف کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ پھر چہرہ پھیر کر آنوسی دروازے کو دیکھا اور ٹیک چھوڑی۔ لمحے بھر کو دستگیر ٹھہر گیا۔ کیا وہ اُسکے انتظار میں کھڑی تھی؟ سر جھٹک کر باقی ماندہ سیڑھیاں بھی اتر کر وہ اپنی گاڑی کی جانب بڑھا کہ وہ مزید اس سراب کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہتا تھا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" عین عقب سے آتی آواز پر گاڑی کا دروازہ کھولتے دستگیر نے چہرہ پھیر کر پیچھے دیکھا۔ وہ اُسکی جانب ہی متوجہ تھی۔ اُسکے عین عقب میں سینے پر بازو باندھے، فرصت سے متوجہ تھی۔ اُسکی دھڑکنیں ماند پڑنے لگیں۔

"کریں۔" سنبھل کر اُسکی جانب رُخ کرتے ہوئے سنبھل کر کہا۔ لمحے بھر کو وہ سوچ میں پڑ گئی کہ آیا کہنا بھی چاہیے یا نہیں مگر۔۔۔

"آپ میرے معاملات سے دُور رہیں۔" وہ سُنبھری آنکھیں، ساکن سیاہ آنکھوں میں دیکھ کر قطعیت سے کہہ رہی تھیں۔

"میں سمجھا نہیں۔۔۔" وہ جانتا تھا مگر جان کر اَنجان بن گیا۔

"اس گھر کے ہر فرد کا یہی مسئلہ ہے۔" نگاہوں کا زاویہ بدل کر کہا اور دستگیر اُسے دیکھ کر رہ گیا۔ اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ خود کو اس گھر کا فرد سمجھنے میں ناکام تھی۔ گیارہ بجے کی دھوپ کی چھن پر اُس نے آنکھوں کے آگے ہاتھ چھبے کی صورت رکھ لیا۔

"میری بات کان کھول کر اچھی طرح سُن لیں، دستگیر صاحب۔" یک دم اُسکا لہجہ بدلا۔ لہجے کی سختی پر دستگیر نے اُس دُھوپ کی تمازت سے سُرخ ہوتے چہرے کو دیکھا اور پھر قدرے سائیڈ پر ہوا۔ یوں کہ وہ دُھوپ اور اُسکے درمیان حائل ہو گیا۔ وہ جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی، آنکھوں کی چبھن معدوم ہونے پر ہاتھ پہلو میں گرائے اُسے دیکھنے لگی جسکے اُونچے لمبے قد کی بدولت سورج کی شعاعیں اُس تک پہنچ نہیں پا رہی تھیں۔

"میں سُن رہا ہوں۔" اُسکے نرمی سے کہے جانے پر پلکیں جھپک کر وہ تیزی سے دو قدم سائیڈ پر ہوئی۔ سورج پھر سے اُن سُنہری آنکھوں میں پڑنے لگا تھا مگر اُدھار کا، عارضی سہارا اُسے نہیں قبول تھا۔ دستگیر اُسے دیکھتا رہا۔

"آئندہ اگر آپ نے میری جانب سے تایا جان کو کوئی پریشانی دی تو یاد رکھیے گا میں ہر ادب لحاظ بھول کر آپکی خبر بہت اچھے سے لوں گی۔" اِس بات پر سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں کو چمکتے دیکھ کر وہ ساکن سی چہرہ اٹھائے اُسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کے منصور کو لے کر جو بھی شک ہیں اُنہیں برائے کرم اپنی ذات تک رکھیں۔ منصور سے میرا کیا تعلق ہے وہ آپ اور آپکے گھر والوں کا مسئلہ نہیں۔" وہ بغیر رُکے کہے جا رہی تھی۔ دستگیر نے اِن کئی سالوں میں اُسکو کبھی یوں بنا اُس سے جھجکے، گھبرائے، نظریں چُرائے، لڑکھڑاتے لہجے کے سواء بات کرتے نہیں سنا تھا۔

"تایا جان کے سامنے دوبارہ کچھ بھی کہنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھیے گا کہ وہ دِل کے عرضے میں مبتلا ہیں اور اُنکو ایک اٹیک آچکا ہے۔" آخری بار کہہ کر وہ اُسکی حیرت سے پھیلتی آنکھوں کو نظر انداز کر

کے تیزی سے اُسکے سامنے سے ہٹ گئی۔ اب اگر اُسے اپنے باپ کا خیال ہے تو ہزار بار کہنے سے پہلے سوچے گا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ریورس کرتے ہوئے اُس نے ایک سرسری نگاہ اُس پر ڈالی جو ابھی تک وہیں ساکت و جامد کھڑا تھا یوں جیسے اُسکے لیے یہ نئی بات ہو، یوں جیسے وہ اس بات سے واقف ہی نہ۔ ایسے ہو سکتا ہے بھلا؟ سر جھٹک کر وہ گاڑی گھر سے نکال کر میں روڈ پر ڈال چکی تھی اور دستگیر نے چہرہ پھیر کر پیچھے دیکھا جہاں ڈائینگ ہال کی کھڑکی تھی۔ ذہن میں ہوتی توڑ پھوڑ کے ساتھ اُس نے نگاہیں بدل کر وہاں دیکھا جہاں اُسکی گاڑی کھڑی تھی مگر ظاہر ہے علی نہیں تھا۔ فلحال وہ گاڑی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ مرے قدموں کے ساتھ ڈار یونگ سیٹ کا دروازہ وا کر کے اُس نے سٹیرنگ سنبھال لیا اور کچھ ہی دیر بعد اُسکی گاڑی میں روڈ پر فرائے بھرتے ہوئے گاڑیوں کے رش میں آگے سے آگے ہی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

"آپ لوگ بھی کچھ دن ہی شادی کے بعد گھومنے پھرنے گئے۔" وردہ کے کہے جانے پر ثمن مسکرا دی۔

"ہاں! تمہارے بھائی مصروف ہوتے ہیں نہ لیکن اب سب مل کر جائیں گے تو خوب انجوائے کریں گے۔" ثمن تو ابھی سے اُن سب کی طرح بے حد ایکسائیٹڈ تھی۔ وہ ایک ملن سار، خوش مزاج اور کھلے ذہن کی لڑکی تھی تبھی اتنے بڑے خاندان میں دو، تین ہفتوں میں ہی گھل مل گئی تھی۔

"ویسے ہمیں کہاں جانا چاہیے؟" عروہ کو نئی فکر ستانے لگی۔

"اتنا کچھ ہے پاکستان میں دیکھنے کو۔" فروہ تو بس باہر جانے کے احساس سے ہی خوش تھی پھر چاہے اُسے اسلام آباد کے دامن کوہ لے جایا جاتا یا پھر سوات کے کالام، وہ تیار تھی۔

"میرا تو دل کر رہا ہے آپ، آج ہی چلے جائیں۔" زینی کا بس چلتا تو پر لگا کر اڑ جاتی۔ اُسکی بات پر سبیل کی ہنسی نکل گئی جبکہ زینی نے خفا نظروں سے اُسکو دیکھا۔

"اچھا اچھا کوئی لڑائی نہیں، ہم انشاء اللہ اگلے ہفتے ہی جائیں گے۔" ردانے پہلے سے ہی لڑنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں جانے کی پلاننگ ہو رہی ہے؟" آواز پر سب نے چہرہ پھیر کر اندر نزاکت سے سہج سہج کر چل کے آتی نہیہا کو دیکھا جسکی آج سچ دھج ہی نہیہا تھی۔

"نہیہا باجی! تائی جان تو کہہ رہی تھیں آپ بیمار ہیں۔" اُسکو سر تا پا دیکھتی زینی کی زبان نے سب سے پہلے اُسکا ساتھ چھوڑا جبکہ نہیہا پھیکے پڑتے چہرے سے مسکرا کر خالی صوفے پر آ بیٹھی۔

"بس نظر لگ گئی تھی مجھے۔" تازہ سٹیپ کٹنگ والے بلونڈ بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اطمینان سے بتایا گیا جبکہ باقی سب نے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

"کس کی؟" جواب مسکراتے سبیل کی جانب سے آیا تھا۔

"میری اپنی ہی۔" اُسکے جواب پر سب لڑکیوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ نہیہا بہت خود پسند لڑکی تھی مگر وہ ہمیشہ دوسرے سے سراہے جانے کی چاہ رکھتی تھی اور آج اُسکے الفاظ، اُسکا لہجہ اُن سب کو ٹھٹھکانے کے لیے کافی تھا۔

"کہاں جانے کی پلاننگ ہو رہی تھی؟" خاموشی پر نیہا نے پھر سے وہی سوال دہرایا۔

"دستی بھائی ہم سب کو گھومنے لے کر جائیں گے اگلے ہفتے۔" زینی کا جوش قابلِ دید تھا جبکہ نیہا کی آنکھوں میں چمک اُترتے دیکھ کر رِدا نے پلکیں سُکیر کر اُسکو دیکھا۔

"اِسکا مطلب ہے کہ مجھے بھی جانا پڑے گا۔" بالوں کی لِٹ اُنکی پر لپیٹتے ہوئے وہ کسی سوچ میں مگن نظر آ رہی تھی جبکہ باقی سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وردہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا اُسکے کھوتے کے رنگ جیسے بال کاٹ دیتی اُس بات کی وجہ سے جو اُس نے دِستگیر کا جھوٹا نام لے کر خاندان بھر میں پھیلا رکھی تھی۔

"ارے نیہا! میری بیٹی کیسی ہے اب؟" فیروزہ بیگم کی حیران، خوشگوار آواز پر نیہا مُسکراتے ہوئے صوفے سے اُٹھی جبکہ وردہ اور رِدا ماں کو افسوس سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"اگر ہم ناردن ایریاز جائیں تو بر فباری تو ہو گی نہیں۔" عروہ کے انداز پر باقی سب کا جی چاہا ماتھا پیٹ لیں۔

"گر میوں میں بر فباری تو ہونے سے رہی لیکن وہاں کی خوبصورتی تو ہو گی نہ۔" سبیل کی بات سے سب کو ہی اتفاق کرنا پڑا۔

"تم بھی جا رہی ہو نہ پھر۔" نیہا جانتی تھی کہ اُسکی خالہ سوال نہیں کر رہی تھیں۔

"ظاہر ہے، دستی لے کر جا رہا ہے۔" اُسکے یوں اترانے پر باقی سب نے غصیلی نگاہوں سے اُسکو دیکھا جبکہ فیروزہ بیگم سب کی سخت نظریں نیہا پر لگی دیکھ کر چونک گئیں۔

"ہاں اور جب دَستی لے کر جائے تو تمہیں حق سے جانا چاہیے۔" اُن سب کو دیکھتے ہوئے اُنہوں نے جس انداز میں کہا وہ سب کو یہ باور کروانے کو کافی تھا کہ اپنے بیٹے کے لیے اُنکا انتخاب ہمیشہ نہیہا ہی رہے گی۔ اُن خالہ، بھانجی سے نظریں ہٹا کر سب لوگ پھر سے آنے والے ٹرپ کی پلانگ میں مگن ہو گئے کہ وہاں کیسے کپڑے پہن کر جائیں گے؟ کون کون سی جگہوں پر زُخرف اُنکو لے کر جائے گی؟ اُس ذکر پر نہیہا نے خون آشام نظروں سے دَستگیر کی بہنوں کو اور پھر فیروزہ خالہ کو دیکھا جنہوں نے اُسکا شانہ تھپتھا کر جیسے خاموش تسلی دی کہ وہ سب سنبھال لیں گی۔

"نکل گیا گھر کے لیے؟" ارمان کی کال اٹینڈ کرتے ہی دوسرے جانب اُسکے چڑے انداز پر اُس نے مُسکراہٹ دبائی جبکہ بیک ویو مرر سے اُسکو یوں مُسکراتا دیکھ کر علی کے چہرے کو بھی مُسکراہٹ چھو گئی۔

"ہاں! کچھ تیاری کرنی ہے کل جانے کے لیے اور تم، صبح سویرے گھر پہنچو گے۔" اُسکے تپنے کو ذرہ اہمیت نہ دیتے ہوئے آرام سے حکم صادر کیا گیا اور کال مُنقطع کر دی گئی اُسکو پیچ و تاب کھاتا چھوڑ کر۔

"سر؟" کچھ دیر بعد علی کی آواز پر اُس نے سیل فون جیب میں رکھتے ہوئے اُسکو دیکھا جو پورے اِنہاک سے ڈرائیونگ کی جانب متوجہ تھا۔

"کہو علی!" کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کل ایبٹ آباد ارمان صاحب کے ساتھ جائیں گے؟" اُسکے پوچھے جانے پر دستگیر یو نہی باہر دیکھتا رہا۔

"ہاں اور کل تمہارا آف ہے۔ تم ایک دن کے لیے اپنے گاؤں چلے جانا۔" دستگیر کے کہے جانے پر اُسکا جی چاہا خوشی سے ناچے۔ سب ایسی ہی بات کا بتنگڑ بناتے رہے تھے۔ اُسکا یہ والا سب مالکوں سے زیادہ اچھا تھا۔ نرم مزاج، ہنس مکھ، عزت کرنے والا اور کام بہت کم دینے والا اور سب سے بڑھ کر گھر کے چکر اُسکے ہاں کام کرنے کے بعد سے وہ بہت لگانے لگا تھا اور گھر والے اُسکے نئے صاحب سے بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ ایک تو تنخواہ شاندر اوپر سے مرعات بے حساب۔ علی محمد اپنی اس نئی نوکری سے بے حد خوش تھا۔

"سر گھر آ گیا۔" علی کے کہے جانے پر چونک کر اُس نے علی کو دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اتوار کی وجہ سے وہ بیگ ساتھ نہیں لے کر نہیں گیا تھا۔

"تم گاڑی لے کر گاؤں جانا۔" اُسکی اگلی بات پر علی محمد کی آنکھیں حیرت سے وا ہوئیں۔ اور پھر دستگیر کو وہ حیرانگی سے اندر جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی بڑی، اتنی مہنگی گاڑی اُسکو اپنے گاؤں لے جانے کا کہہ رہا تھا باقی مالکوں کی طرح بس پر دھکے کھاتے ہوئے جانے کو نہیں۔ مسکرا کر اُس نے گاڑی ریورس کی اور ملک ہاؤس پر ایک نگاہ ڈال کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

"اسلام و علیکم خان بابا!" اُنکو سلام کر کے وہ جو آگے بڑھنے والا تھا، رک گیا اور پھر خان بابا کو دیکھا جو شاید ضروری کام سے جا رہے تھے مگر کچھ کہنے بھی چاہ رہے تھے اُس سے۔

"کچھ کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟" اُنکو یوں ہچکچاہٹ اور سوچ کا شکار دیکھ کر اُسکو حیرانگی ہوئی تھی۔

"جی وہ میں ضروری کام سے جا رہا ہوں، مصطفیٰ صاحب اور باقی سب آج سیف صاحب کے گھر جمع ہیں لیکن زُخرف بیٹی کو نہیں معلوم۔" اُنکے کہے جانے پر اُس نے چونک کر اُنکو دیکھا جو بات مکمل نہیں کر پا رہے تھے۔

"مصطفیٰ صاحب نے کہا ہے کہ وہ اُنکی لائبریری میں ہوں گی تو آپ کیا اُنکو بتائیں گے۔" اُنکے ہچکچانے پر دستگیر نے گہرا سانس لے کر اُنکو دیکھا۔

"جی! آپ اپنے کام سے خیریت سے جائیں۔" آگے ہو کر اُنکا کندھا نرمی سے تھپک کر وہ تیزی سے اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا جبکہ خان بابا ڈرائیور کے ساتھ تیار گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

ہال کی بتیاں روشن دیکھ کر وہ جو آہستہ قدموں سے لائبریری جا رہا تھا، کسی کی لائبریری کی پاس لاونج میں موجود گی محسوس کر کے ٹھٹکا۔ وہ نہیہا ہی تھی جو ایک ادا سے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے، بالوں میں اُنگلیاں چلا رہی تھی۔ اسکو ایک نظر دیکھ کر وہ جیسے ہی آگے بڑھا، توہین کے احساس سے نہیہا ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہیں کیا لگا تھا میں ڈر جاؤں گی۔" وہ جیسے سب کی غیر موجودگی سے واقف تھی تبھی چلا کر بولی۔ دستگیر کی بے اختیار نگاہ راہداری کے آخری سرے پر موجود لائبریری تک گئی۔ کتاب کا مطالعہ کرتی زُخرف نہیہا کی چیختی آواز پر تیزی سے کتاب بند کر کے دروازے تک حیرانگی سے آرہی تھی۔

"نہیں! مجھے معلوم ہے کہ تم کتنی ڈھیٹ ہو۔" وہ یقیناً دستگیر کی آواز تھی۔ ٹھنڈی ٹھار۔ اُسکا ہاتھ ہینڈل سے پھسل کر پہلو میں آگرا۔

"تم۔۔۔ دستگیر۔۔۔ تمہیں کیا لگا میں اتنی آسانی سے پیچھے ہٹ جاؤں گی۔" تیزی سے اُسکے سامنے آتے ہوئے وہ انجام سے بے پرواہ لگ رہی تھی۔ دستگیر کی سرد نظریں محسوس کر کے وہ دو قدم پیچھے سر کی

"تمہیں جو زبان سمجھ میں آتی ہے میں اس وقت اُس زبان میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔" آہستگی سے کہہ کر وہ جو آگے بڑھنے لگا تھا، نیہا اس سے پہلے کے اُسکا ہاتھ تھامتی۔

"تمہاری خیریت اسی میں ہے نیہا بی بی کہ مجھ سے دُور رہو۔" ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر کہا گیا۔ زُخرف کی موجودگی کا احساس اُسکو کچھ بہت سخت کہنے سے باز رکھے ہوئے تھا۔ اُسکو یونہی شل سا چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

"تم۔۔۔ تم دستگیر مُصطفیٰ نہیں ہو۔" دروازے کے اُس پار کھڑی زُخرف، نیہا کے اس سوال پر ساکن سی رہ گئی۔ کیا واقعی دستگیر کا نیہا سے کچھ لینا دینا نہیں تھا تبھی وہ اُس سے اس اجنبیت اور سختی سے بات کر رہا تھا؟؟

"سمجھ آگئی نہ، گڈ فار یو۔" کہہ کر اُس نے گھڑی کو دیکھا۔

"کہاں جا رہے ہو، میری بات ختم نہیں ہوئی۔" اُسکو لائبریری کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ تیزی سے اُسکے پیچھے آ رہی تھی۔ قدموں کی آواز پر لمحے بھر کو زُخرف کا ذہن بلینک ہو گیا۔ چہرہ پھیر کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ دبے قدموں بھاگ کر لائبریری سے ملحقہ ریست روم کی جانب گئی۔

"تمہیں میں نظر کیوں نہیں آ رہی۔۔۔" دروازہ کھول کر اندر دیکھتے ہوئے وہ پیچھے سے آتی آواز سرے سے سُن ہی نہیں رہا تھا۔ صوفے پر کھلی کتاب پڑی دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور پھر اُسکی نگاہ ہلتے پردوں تک گئی اور نہ جانے کیوں اُسکے چہرے کو مُسکراہٹ چھو گئی یعنی اُس نے غلطی سے اُن کی باتیں سُن لیں تھیں اور اب یقیناً خود کا لاعلم ظاہر کرے گی۔ یہاں اُسکو کڑی نگاہوں سے پردہ پیچھے کرتے دیکھ رہی تھی۔

"زُخْرُف۔۔۔" اُس نام پر نیہا نے کرنٹ کھا کر وہاں دیکھا جہاں دَسْتگیر جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے وہاں آئی جہاں کھلی کھڑکی کے پاس زُخْرُف کتاب پڑھ رہی تھی۔ لمحے بھر کو اُسکا رنگ اُڑا۔ نہیں، لاونج اور اِس جگہ کا فاصلہ زیادہ ہے یقیناً اُس نے کچھ نہیں سُنا۔۔۔ چہرہ پھیر کر زُخْرُف نے حیرانگی سے اُسکو دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ اُسکے لیئے یہاں آیا تھا۔ جبکہ دَسْتگیر کی آنکھیں مُسکراتے دیکھ کر زُخْرُف نے نگاہ بدلی، کہیں اِسکو معلوم تو نہیں۔۔۔۔۔ نہیں اِسکو کیسے ہو گا۔۔۔

"سب سیف چچا کے گھر رات کا کھانا کھائیں گے۔ بابا جان بلا رہے ہیں۔" یہ پہلی تفصیلی بات تھی جو دَسْتگیر مُصطفیٰ اُس سے آٹھ سالوں بعد کر رہا تھا۔ اُسکے لہجے کی نرمی، اپنائیت، احترام پر نیہا کا دل دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ وہ اُس سے نہ تم کہہ کر مُخاطب ہوا تھا نہ آپ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ سب سے مُختلف کیوں پکارتا تھا ہمیشہ اِس عورت کو۔۔۔ نیہا نے اپنی مُٹھیاں بیچ لیں۔ جبکہ ساکن سی زُخْرُف نیہا کو دیکھے بغیر، کتاب ٹیبل پر رکھ کر اُن دونوں کے برابر سے نکلتی چلی گئی۔ نیہا کو دیکھے بغیر وہ بھی پلٹ رہا تھا۔ یعنی وہ یہاں زُخْرُف کو بلانے آیا تھا، بیچ میں وہ مُفت میں ذلیل ہو گئی تھی۔۔۔

"آب کیسی طبیعت ہے؟" ایک ہفتے کے بعد وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا تھا۔ کاسٹ اُتراتے منصور نے چونک کر اُسکو دیکھا۔ لمحے بھر کو وہ اُسے دیکھے گیا۔ آخر یہ لڑکی کرنے کیا والی ہے؟ نرس کو جاتے دیکھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس نے منصور کو دیکھا جسکی جانچتی نظریں اُسکو اپنے اندر اُتری محسوس ہو رہی تھیں۔

"ارادے کیا ہیں تمہارے؟" نرس کے جاتے ہی وہ جو ضبط کر کے بیٹھا تھا، پھٹ پڑا۔ زُخرف کے لیے اُسکو یوں اُچھلتے دیکھنا بڑا اچھا تجربہ تھا مگر فلحال تایا جان کی صحت کی وجہ سے وہ اُسکو بھڑکانا نہیں چاہتی تھی۔

"یہ تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔" وہ بے حد مطمئن نظر آ رہی تھی جیسے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔ منصور یونہی اُسکو دیکھے گیا۔

"تمہیں مجھ سے آج بھی شادی کرنے کا بھوت سوار ہے یا اُتر گیا؟" اس غیر متوقع سوال پر منصور نے بستر سے اُترتے ہوئے اُسکو دیکھا جو اُسکو اپنی جانب قدم بڑھاتا دیکھ کر آج نہیں پیچھے ہٹ رہی تھی۔

"اگر نہیں اُترا ہو تو؟" عین سامنے آ کھڑے ہوتے ہوئے وہ چہرے جھکائے اُسکو دیکھ رہا تھا جسکے چہرے کے تاثرات اس سوال پر بھی واضح نہیں ہوئے۔

"تو شرافت سے، عزت سے میرے سامنے آؤ۔ تمہیں میں دوبارہ نقب لگانے نہیں دوں گی۔" انداز بے حد سرد تھا۔ منصور نے پلکیں سکیر کر اُسکو دیکھا مگر وہ اُسے آج پڑھ لینے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا اس لیے وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اچھا۔۔ تو پھر سیدھی بات تو میری جانتی ہی ہو تم۔" اُسکے خباثت بھرے انداز پر زُخرف نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ یہ شخص کبھی سدھر نہیں سکتا۔ اُسکے دل پر اللہ پاک غفلت کی مہر لگا چکے تھے۔

"میں یہاں تمہاری گھٹیا سوچ کو جانچنے نہیں، ضروری بات کرنے آئی ہوں۔" اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے وہ گھر درے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ کسی احساس سے منصور کی مکار آنکھیں چمکنے لگیں۔

"کیسی ضروری بات۔۔ او کہیں تمہیں تمہارے پیاروں نے پھر بے یقین تو نہیں کر دیا۔" وہ اب اُسکی کیفیت سے حظ اُٹھا رہا تھا۔ زُخرف یو نہی سنجیدگی سے اُسکے چہرے کو دیکھتی رہی جو اور نہ جانے کیا کیا بکواس کیئے جا رہا تھا۔ کیا اُسکو اس شخص کے سامنے جھک جانا چاہیئے؟

"کل اپنی ماں کو شادی کی بات کرنے بھیج رہے ہو تم۔" وہ جو بکے چلا جا رہا تھا، ایک دم ٹھہر گیا۔ چونک کر اُسکو بغور دیکھا جو مَر جانے کی حد تک سنجیدہ تھی۔

"یعنی تم میرے آگے گھٹنے ٹیک رہی ہو۔" اُسکے کہے جانے کو ذرا نہ خاطر میں لاتے ہوئے بیگ ٹیبل سے اُٹھا کر اُسکو دیکھا۔

"تمہیں برآت والے دن مجھ سے نکاح کرنا ہو گا منصور ورنہ ساری زندگی بھی ایڑھی چوٹی کا زور لگاتے رہے میں تمہارے ہتھے نہیں چڑھنے والی۔" اُسکی اگلی بات پر منصور کی پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں۔

"تم پہلے ہی میرے نکاح۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کر پاتا۔

"اُس نکاح کی حقیقت اِس دُنیا میں اللہ کے ساتھ تین لوگ جانتے ہیں منصور چوہدری سُو میرے سامنے دوبارہ یہ بکواس مت کرنا۔" اُسکے یوں کڑے انداز کر لمحے بھر کے لیے منصور چونک اُٹھا۔

"کون تین لوگ؟" اِس سوال نے زُخرف کے چہرے پر مُسکراہٹ دوڑا دی۔

"تم، میں۔۔۔ اور۔۔۔" ٹھہر کر اُس نے بغور منصور کو دیکھا جسکا انداز لا پرواہ نہیں لگ رہا تھا اب۔

"اور قاسم۔۔۔" وہ نام نہیں تھا، قیامت تھی جو اُس نے منصور کے سر پر ڈھا دی۔ منصور حیرانگی سے اُسکو دیکھ رہا تھا جو اب بڑے ہی اطمینان سے اُسکے چہرے کے اڑتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"تم۔۔۔ چاہتی کیا ہو؟" یہ سوال کرتے ہوئے اُسکو اپنی آواز اجنبی محسوس ہونے لگی۔

"بتا تو دیا ہے۔ اب اگر تم نے دوبارہ مجھ سے وہی گھٹیا بات کہی تو ذہن میں رکھنا کیا کر سکتی ہوں میں۔" اُسکے انداز حتمی تھی مگر منصور اُلجھ رہا تھا۔

"کیا کر سکتی ہوں تم۔۔۔؟" وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ آخر اُس سے جان چھڑوانے کے بجائے وہ اُس سے شادی کی بات کیوں کر رہی تھی۔

"آئینہ تو روز ہی دیکھتے ہو گے تم۔ کبھی بتایا نہیں تمہیں تمہارے عکس نے کہ زُخرف ملک نے کیا کر دیا ہے تمہارے چہرے کا حال۔" اُسکے چہرے پر موجود اُس واضح، زخم کے نشان کو دیکھتے ہوئے اُس نے منصور کا چہرہ اہانت سے مزید سُرخ کر دیا۔ وہ چہرہ جو پہلے ہی اُس نشان کی وجہ سے بہت خوفناک لگتا تھا، مزید اپنی ہیبت بڑھانے لگا۔

"اس زخم کا بدلہ تو میں تم سے سود سمیت واپس لوں گا، زُخرف بیگم۔" دائیں گال اور آنکھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسکا لہجہ قطعیت بھرا تھا۔

"کل اپنی ماں کو بھیج دینا شادی کی تاریخ کے لیے اور یہ بھی وہ آکر بتائیں گی کہ نکاح دوبارہ ہو گا۔" انگلی اٹھا کر اُسکو کہتے ہوئے اُس نے منصور کے دماغ میں کسی انتقامی خیال کو مزید دوام بخش دیا۔

"جب تمہیں مجھ سے شادی میں مسئلہ نہیں تو میں کیوں پیچھے قدم ہٹانے لگا۔" اُسکے سپاٹ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے وہ خباثت سے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ زُخرف اُس پر آخری نگاہ ڈال کر برابر سے گزرنے لگی۔

"ویسے نکاح نہ کیا تو کیا کر لو گی تم؟" اُسکی محضوظ ہوتی آواز پر وہ ٹھہری مگر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"تو میں تمہاری دوسری آنکھ بھی زخمی کر دوں گی۔" سرد لہجے میں کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور پیچھے منصور تلملا کر رہ گیا۔

"تمہیں ایک بار پھر بھرے مجمع میں ذلیل و خوار نہ کروایا تو میرا نام منصور چوہدری نہیں۔" ہاتھوں میں مٹھیاں بیچتے ہوئے وہ نفرت سے پھنکار کر کہہ رہا تھا مگر جسکو کہہ رہا تھا وہ اُسکے منہ پر طمانچہ مار کر ہسپتال کی پارکنگ لاٹ سے گاڑی ریورس کر کے نکل رہی تھی۔

"تم یہیں رُکو گے۔" گاڑی سے اتر کر ہاتھ میں تھامی چھوٹی سی ٹارچ جلاتے ہوئے اُس نے ارمان کو دیکھا۔

"لیکن ڈیسٹر۔۔۔۔" وہ جو سیٹ بیلٹ کھول کر نیچے اُترتے لگا تھا، ٹھہر گیا۔

"اُس این آڈر!" یہ تین الفاظ۔۔۔۔ آہ! ہمیشہ یہی تین الفاظ اُسکو بے بس کر دیتے تھے۔ دستگیر کے جاتے ہی اُس نے سٹیرنگ پر زور سے ہاتھ مارا اور پھر گاڑی ریورس کر کے گھنے درخت کے نیچے کھڑی کر دی جبکہ دوسری جانب وہ چھوٹی سی سیاہ ٹارچ منہ میں دبائے اُس قلعے کی اونچی دیوار پھلانگ گیا۔ ایک راہداری سے دوسری راہداری میں جاتے ہوئے وہ مطلوبہ شخص کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ کیسا دکھتا تھا اُسے کچھ معلوم نہیں تھا مگر ڈیسٹر نے کبھی کبھی گولیاں نہیں کھیلیں تھیں۔ ایک کمرے کی کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ٹھہر گیا۔ ٹارچ منہ سے نکال کر اُس نے مدہم روشنیاں محسوس کرتے ہوئے اُس کھڑکی پر ہاتھ پھیرا۔ ٹول کر دیکھتے ہوئے اُس نے آہستگی سے کھڑکی کھولی اور اندر کو کود گیا۔ باہر کی نسبت یہ قلعہ نما حویلی اندر سے روشن تھی۔ آہٹ پر وہ تیزی سے دروازے کے پیچھے ہوا اور پھر ایک شخص کو اندر آتے دیکھ کر اُس نے سر تا پا اُسکا جائزہ لیا جبکہ وہ شخص دروازہ بند کرنے کو جیسے ہی پلٹا، سیاہ لباس میں موجود اُس نقاب پوش کو دیکھ کر لمحے بھر کو اُسکی قوتِ گویائی سلب ہوئی اور پھر۔۔۔

اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر اُس پر حملہ کرتا، ڈیسٹر نے لات گھما کر اُسکے سینے پر ماری اور وہ جو اس اچانک، غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا، پیچھے پڑے صوفے پر جا گرا۔ سر صوفے کی پشت سے ٹکرایا اور لمحے بھر کو آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتا، ڈیسٹر ایک ہی جُست میں اُسکے سر پر پہنچا۔ بائیں بازو کی کہنی اُسکی شہ رگ پر رکھتے ہوئے اُسکو کھانسنے پر مجبور کر دیا۔

"کلک۔ کلکون ہو۔۔۔" تکلیف کے باعث اُس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایک نگاہ پیچھے آدھ کھلے دروازے کو دیکھ کر ڈیسٹر اُسکے کان کے پاس جھکا۔

"اگر اب اس مُنہ سے کوئی اور بات نکلی تو۔۔۔" کہہ کر اُس خود کو چھڑوانے کی کوششوں میں نڈھال ہوتے شخص کی انگلیوں مرورڈ دیں۔ تکلیف کے مارے وہ چیخ بھی نہیں سکا۔

"قاسم کہاں ملے گا؟" اُسکے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اُس نے جیب سے پلاس نکال کر اُسکے سامنے کیا جو خوف سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"ب۔۔۔ باس۔۔۔" بامشکل تھوک نکل کر وہ کہہ پایا۔

"شاباش۔" پلاس ہاتھ میں دباتے ہوئے وہ اُسے بولنے پر اکسارہا تھا۔

"ب۔۔۔ باس، ہال کمرے میں ہوں گے، سربراہی کرسی پر۔۔۔" اُسکو یوں فراٹے سے بولتے دیکھ کر ڈیسٹر نے کہنی اُسکی گردن سے ہٹائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسکو یونہی خود کو نقصان پہنچائے بغیر جاتا دیکھ کر، پہلے اُس شخص کی آنکھیں حیرت سے وا ہوئیں اور اس سے پہلے کہ وہ مدد کو چیختا، تیزی سے پلٹتے ڈیسٹر نے بائیاں ہاتھ کھڑا کر کے اُسکی گردن کے عقب میں مارا اور وہ لہرا کر پھر سے آنکھیں موندتا ہوا صوفے پر جا گرا۔

"ٹیک اٹ ایزی، برو۔" کان میں موجود آلے سے ابھرتی آواز پر گہرا سانس لے کر وہ خاموش قدموں سے باہر نکلا اور پیچھے اُس کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"چھوٹے موٹے بد معاشوں کا گڑھ لگ رہا ہے یہ قلعہ۔" پلاس سیاہ جیکٹ کی جیب میں اڑاتے ہوئے، اب وہ ایک موٹی سی زنجیر نکال کر بائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر اُس پہ چڑھا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن اگر تم قاسم کو دیکھ کر آپے سے باہر ہوئے تو میں اندر آ جاؤں گا۔" دوسری جانب کی دھمکی سُن کر وہ دھیرے سے مُسکرا دیا مگر اُسکی آنکھوں میں ایسی ٹھنڈک تھی کہ وہ پورا قلعہ برف کر سکتی تھیں۔ مزید دو ہالوں سے گزرتے ہوئے وہ اُس ہال میں آیا جہاں ایک بڑی سی میز پر کرسیاں لگائے لگ بھگ اُٹھ لوگ ایک بندے کی سربراہی میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ آہٹ پر سب نے پلٹ کر دیکھا اور پھر وہاں ایک اجنبی، سیاہ نقاب پوش میں موجود شخص کو دیکھ کر سارے کرسیاں چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے سوائے سربراہی کرسی پر موجود شخص کے۔

"قاسم کون ہے۔۔" سیدھے ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے وہ سب ہی سے استفسار کر رہا تھا مگر سارا دھیان سربراہی کرسی پہ بیٹھے شخص پر تھا۔

"میرے پاس فرصت ہی فرصت ہے۔" اُن سب کو یونہی خاموش سے دیکھ کر وہ دو قدم آگے آیا جبکہ سربراہی کرسی پر موجود شخص اُسکو بے حد تسلی سے دیکھنے لگا۔

"فیئر اینڈ سکور۔" اُن سب کو بازو چڑھاتے دیکھ کر وارن کرنا چاہا مگر وہ سب کو ایک ساتھ پل پڑھنے پر تیار دیکھ کر اُس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور پھر وہاں گویا گھمسان کا رَن پڑتا نظر آنے لگا۔ وہ سیاہ نقاب پوش، اُن آٹھ لوگوں کو بُری طرح نہتا پیٹنے لگا۔ ہاتھوں میں پہنی اُس زنجیر سے کوئی کرسیوں پر زخموں سے چُور پڑا سسک رہا تھا تو کوئی میز کے نیچے، کوئی اُس شخص کے بھاری بوٹوں کے نیچے اور کوئی سربراہی کرسی پر بیٹھے شخص کے حیران چہرے کے عین سامنے۔ آخری ہٹے کٹے اور خود

سے ڈیل ڈول میں ڈبل شخص کو بالوں سے گھسیٹتا ہوا وہ اُس شخص کی جانب لا رہا تھا جسکا نام یقیناً قاسم تھا۔

"میں۔۔۔ قاسم۔۔۔" اُسکو یوں سر پر آتے دیکھ کر تیزی سے بتا کر وہ اُٹھ کھڑا ہونے لگا۔

"پہلے بتا دیتے تو یہ حال نہیں ہوتا سب کا۔" ایک نظر ہال میں ادھر ادھر کراہتے، خون خون ہوئے بدمعاشوں پر ڈال کر کہنے کے ساتھ اُس نے قاسم نامی شخص کو کندھے سے پکڑ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"کون۔۔۔ ہو تم؟" کندھے پر دباؤ بڑھاتیں اُن آہنی انگلیوں کی گرفت پر لب بپنج کر پوچھا گیا۔
"جو پوچھا جائے اُسکا ٹھیک ٹھیک جواب چاہیے۔" ہاتھوں میں لپیٹی زنجیر جس سے خون ٹپک رہا تھا، سہلاتے ہوئے اپنا مدعا رکھا گیا۔

"کیا۔۔۔ پوچھنا چاہتے ہو؟" یہ جان کر کے اُسکو مارنے کا ارادہ نہیں قاسم نے سُکھ کا سانس لیا۔

"کیا دھندہ کرتے ہو؟" اُسکے برابر کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے سوال کیا گیا۔

"بدمعاش آدمی ہوں۔۔۔" اُسکی گرفت سے نکلتے ہی لہجے میں پھر سے پہلے والا غرور لوٹ آیا جسے محسوس کر کے نقاب کے پیچھے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

"بدمعاشی ابھی ساری نکال دینی ہے۔ اصل دھندہ بتاؤ۔" زنجیر کے بل دوسرے ہاتھ سے کھولتے ہوئے وہ اپنے کام میں منہمک تھا۔ قاسم نے ایک نظر اُسکو دیکھا اور تیزی سے کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس بیٹھے ہوئے نقاب پوش نے قدرے آگے کو ہو کر اُسکا کالر ایک جھٹکے سے پکڑ کر کرسی پر لا پٹھا۔

جبکہ اتنے اچانک حملے پر قاسم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسکو دیکھ رہا تھا جواب وہی زنجیر دائیں ہاتھ پر لپیٹ رہا تھا۔

"کچھ تو کرنا پڑے گا قاسم۔۔۔ لگتا ہے تم سہی سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔" چہرہ اٹھا کر اُسکو دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا گیا جبکہ اُن سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر لمحے بھر کے لیے قاسم کا لہو خشک ہونے لگا۔

"میں سچ۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، سامنے والے نے زنجیر میں لپٹا دائیں ہاتھ کی مٹھی بنا کر اُسکے جبرے پر دے ماری۔ وہ پیچھے کو گر جاتا اگر اُسکو کالر سے نہ پکڑا جاتا۔

"اب کچھ مت بتاؤ۔ میں بات اُگلوانے کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔" کھڑے ہو کر اُس نے جیب سے وہی پلاس نکال کر جھکتے ہوئے اُسکی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"تم۔۔۔ کچھ بھی کر لو۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔" قاسم جانتا تھا سامنے موجود شخص بس اُسکو دھمکا رہا ہے۔ ایک نظر اُسکے ہٹ دھرم انداز دیکھ کر ڈیسٹر نے اُسکا بائیاں ہاتھ سختی سے جھکڑ کر اپنے سامنے کیا۔

"ہر غلط سوال پر ایک ناخن مائینس۔۔۔" اُسکا لہجہ ڈرانے دھمکانے والوں جیسا نہیں تھا۔

"منصور کو جانتے ہو؟" اُس سوال پر قاسم کے چہرے کے رنگ اڑتے دیکھ کر ڈیسٹر کی آنکھوں میں لہو اُترنے لگا۔

"ن۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ جانتا۔" اُس جواب پر ڈیسٹر نے ایک گہرا سانس لیا یوں جیسے وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا مگر۔۔۔ وہ ہال جہاں باقی سب پڑے کراہ رہے تھے، اُن کے باس کی دردناک چیخوں سے

گوںج اٹھا۔ کراہتے جسم ساکت سے اٹھنے کی کوشش میں ہلکان آنکھیں پھاڑے اپنے باس کی شہادت کی انگلی سے خون نکلتے دیکھ رہے تھے۔

"چوہدری منصور حلاج۔۔۔۔" الگ ہو چکا ناخن ٹیبل پر اُسکی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے رکھتے ہوئے پورا نام بتایا گیا مگر سامنے والا جانتا تھا۔۔۔ کہ سامنے والا کیا جاننا چاہتا ہے۔

"میں نہیں جا۔۔۔۔" اُسکا جملہ پھر پورا ہونے نہیں دیا اور ایک اور ناخن ٹیبل پر نفاست سے رکھ دیا گیا۔

"میں کچھ نہیں۔۔۔۔" پھر سے جملہ پورا نہ ہو سکا اور ایک مزید ناخن جڑ سے اکھڑ کر سامنے ٹیبل پر آگرا۔ ہر جواب کے بعد اُسکی چیخیں قلعے کی دیواریں لرزا دیتیں۔ اثر نہیں پڑ رہا تھا تو سیاہ نقاب پوش پر۔

"تم نے کبھی قتل کیا ہے؟" سوال اب کی مختلف نوعیت کا تھا۔ چیخ چیخ کر بیٹھ چکے گلے کے ساتھ قاسم نے آنسوؤں سے تر چہرے سے اُسکو دیکھا جسکی آنکھوں میں عجیب طرح کی سفاکیت ناچ رہی تھی۔ گلے میں گٹی ڈوب کر ابھری اور نفی میں سر ہلایا۔

"دُرسٹ جواب۔" پلاس رکھتے ہوئے مُسکراتے لہجے میں کہا گیا۔ اُسکو پلاس رکھتے دیکھ کر درد سے بلبلاتے قاسم کی جان میں جان آئی۔

"جانتے ہو قتل کیسے کیا جاتا ہے؟" زنجیر بھی ہاتھ سے اُتار کر اُن ناخنوں کے سامنے رکھی گئی۔ سسکتے ہوئے قاسم نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"دُرس ت جواب۔۔۔" نقاب سے جھانکتی سیاہ آنکھیں ہر نتائج سے بے پرواہ لگ رہی تھیں۔

"کیا میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں؟" اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے سوال کیا گیا اور قاسم کو لگا وہ سانس نہیں لے سکے گا۔ اُن نظروں کو دیکھتے ہی اُس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"دُرس ت جواب۔۔۔۔" جیکٹ کی جیب سے سیلینسر لگا سیاہ چمکتا پستول نکال کر اُسکی ٹھنڈی نال، سامنے والی کی پسینے سے تر پیشانی پر ٹکائی۔ گرمیوں کے موسم میں وہ پستول کی ٹھنڈی نال، قاسم مجید کو کپکپانے پر مجبور کر گئی۔ انگلیوں میں ہوتی شدید تکلیف کو نظر انداز کیئے وہ آنکھیں میچ گیا۔

"کیا تم منصور کو جانتے ہو؟" وہی سوال، وہی مدعا۔ قاسم مجید نے تیزی سے اقرار میں گردن ہلائی۔ منصور چوہدری اُسکا قتل نہیں کر سکتا تھا مگر سامنے موجود شخص ضرور کر جاتا اگر جو وہ سہی جواب نہ دیتا۔

"دُرس ت جواب۔۔۔۔۔" آنکھیں میچ کر بیٹھے قاسم نے وہ مدہم سرسراتی آواز سُن کر سانس روک لی۔

"زُ۔۔۔۔۔ زُخرف۔۔۔۔۔ مُرضی کو جانتے ہو؟" قاسم جو اگلے سوال کے لیئے تیار تھا، اُس نقاب پوش کے لہجے پر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ پستول کی نال پیچھے ہوئی اور یہاں اُس نے گہرا سانس لے کر سر ہلایا جبکہ ڈیسٹر کو لگا وہ سانس نہیں لے سکے گا۔

"کیسے۔۔۔؟" قاسم نے محدود سوال پر اُسکو دیکھا جس نے نگاہیں اُسکے چہرے سے ہٹا کر ٹیبل پر پڑے لوازمات پہ لگا لیں۔

"منصور کے کہنے پر اُس لڑکی پر میں نے بُری نظر۔۔۔۔" اُسکو جملہ مکمل نہیں کرنے دیا گیا۔ زنجیر یونہی لپیٹے بغیر لمبی کر کے اُسکے چہرے پر مارتے ہوئے باقی الفاظ سلب کر لیے گئے۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ کرسی سے نیچے گرا اور پھر اُس نقاب پوش کی آنکھوں میں لہو اُتر آیا، کوئی جُنون سوار ہو گیا۔ لاتوں، گھونسوں، زنجیروں سے اُسے بے دردی سے مارتے ہوئے وہ یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ اُسکو کہاں لگ رہی ہے۔ لرزہ خیز چیخوں پر کانوں سے الہ نوح کر پھینکتے ہوئے ارمان گاڑی سے تیر کی سی تیزی سے نکلا اور پھر وہ اندھا دُھند قلعہ کی چھت پھلانگ آیا۔

"ڈیسٹر۔۔۔۔۔!" ارمان کی دھاڑ پر بھی وہ ہوش میں نہیں آ رہا تھا۔ اُسکے حواس اُسکا ساتھ بہت پہلے چھوڑ گئے تھے۔ ایک جھٹکے سے ارمان نے اُسکو پیچھے گھسیٹ لیا۔

"چھوڑو۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔" چیختے، چلاتے ہوئے اُسکی آواز تکلیف اور درد سے چلاتے قاسم سے بھی اونچی اور وحشت ناک تھی۔ ارمان اُسکو سنبھالنے کی کوشش میں نڈھال ہو رہا تھا جبکہ وہ اُٹھ لوگ خوف سے تھر تھر کانپنے اُس انسان کو دیکھ رہے تھے جس پر کوئی بھوت سوار تھا۔

"ڈیسٹر۔۔۔۔۔" ارمان کو دھکا دے کر وہ پھر سے قاسم پر پل پڑا جو زخم زخم سر دونوں ہاتھوں میں چھپائے ایسی بے درد مار کھا رہا تھا جو اُس نے آج سے پہلی نہ کھائی تھی، نہ کھلائی۔

"اِس۔۔۔۔۔ اِس۔۔۔۔۔" سر کے پچھلے حصے میں اُٹھتے درد کو نظر انداز کیئے وہ ایک زندہ انسان کو مارتے ہوئے تھک نہیں رہا تھا۔ نہ یہ خبر تھی کہ اُسکو کہاں کہاں چوٹیں آ رہی ہے نہ یہ کہ سامنے والا مر تو نہیں گیا۔

"جان لے گا کیا اُسکی۔۔۔" اُسکو دونوں بازوؤں میں جھکڑتے ہوئے ارمان نے اُسکا کندھا تھپکا۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے، ہاتھ چھڑا کر وہ کینہ توڑ نظروں سے خون تھوکتے شخص کو دیکھ رہا تھا جسکا کوئی نقش سلامت نہیں رہا تھا۔

"ہاں کر دوں گا قتل۔۔" اُسکی دردناک، جگر چاک کرتی دھاڑ نے قلعے کو بھی لرزنے پر مجبور کر دیا۔ جبکہ زخم زخم ہوا قاسم مزید سہم کر خود میں سمٹ گیا۔ وہاں سب اس قدر بُری تواضع کے لیے تیار نہیں تھے۔ آگے آ کر اُسکو کالر سے پکڑے، اب وہ اُسکو گھسیٹتا ہوا باہر لے جا رہا تھا جبکہ قاسم کے جانثار وہی پڑے اپنے زخم سہلا رہے تھے۔

فون کی بجتی بیل پہ وہ جو کام میں غرق تھی، چونک گئی۔ چہرہ اٹھا کر گھڑی پر ٹائم دیکھا جہاں رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ گہرا سانس لے کر اُس نے سیل فون پر آتی احمد دُرانی صاحب کا نام دیکھ کر کام اٹھالی۔

"اسلام و علیکم انکل!" دوسری جانب کی خاموشی پر پہل اُسکو ہی کرنی پڑی۔

"وعلیکم اسلام، ابھی بھی آفس میں ہو؟" اُنکا سوال پُر یقین تھا۔

"جی، آپ واپس آ گئے؟" اُسکے سوال پر احمد دُرانی صاحب کے چہرے کو مُسکراہٹ چھو گئی۔ جانتے تھے کہ جو خبر وہ اُسکو سنانے والے ہیں اُس پر زُخرف خوشی سے اُچھل پڑے گی۔

"ہاں، دوپہر کی فلائیٹ سے تمہارے لیے خوش خبری لے کر آیا ہوں۔" اُنکی بات پر لمحے بھر کو زُخرف کے دل کی دھڑکن تھم گئی۔

"قاسم مل گیا ہے مجھے۔" اُسکی خاموشی پر اُنکو کہنا ہی پڑا مگر دوسری جانب ہنوز خاموشی پر اُنہوں نے کان سے سیل فون نکال کر لائن کی موجودگی کی تصدیق کی۔

"زری بیٹا۔" اُنکے پکارے جانے پر وہ گہری سوچ سے باہر آئی۔

"جی انکل!" اُسکے دھیمے انداز پر وہ چونک گئی۔ ردِ عمل اُنکی سوچ کے مطابق نہیں آیا تھا۔

"کیا ہوا ہے، سب خیریت؟" وہ جانتے تھے کہ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔

"قاسم کو جانے دیں۔ مجھے اب اُسکی ضرورت نہیں۔" اُسکی بات پر وہ جو اطمینان سے بیٹھے تھے، اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا کہہ رہی ہو بیٹا؟" اُنکو اُسکے الفاظ سمجھنے میں مشکل ہونے لگی۔

"جی! میں نے منصور سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" اُسکی اگلی بات پچھلی بات سے بھی زیادہ غیر متوقع تھی۔

"اب قاسم کی ضرورت نہیں۔ منصور مجھ سے سب کے سامنے نکاح کرے گا۔" وہ اُسکے الفاظ پر سناٹے میں رہ گئی۔ کوئی اور کہتا تو وہ کبھی یقین نہ کرتے مگر کہنے والی زُخرف خود تھی۔

"تمہیں کسی کے دباؤ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔" اُنکو آہستگی سے کہنا پڑا۔

"نہیں انکل! یہ فیصلہ میرا ہے، کسی دباؤ کے بغیر۔" دوسری جانب وہ اتنی ہی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"لیکن ایسی بھی کیا مجبوری آن پڑی ہے بیٹا۔۔۔" وہ اُسکے لیے بے حد متفکر ہو گئے تھے، زُخرف کو خبر تھی اس بات کی۔

"مجبوری نہیں انکل اور کوئی آپشن نہیں ہے میرے پاس اور تایا جان کی صحت ایسی نہیں ہے کہ وہ حقیقت سے سکے۔" اُس جواب اس بار اتنا واضح تھا کہ کوئی اور سوال کی ضرورت باقی ہی نہیں رہی۔

"عباد سے اچھا آپشن تمہیں کہاں ملے گا۔" اُسکی بات پر زُخرف کے سنجیدہ چہرے کو مسکراہٹ چھو گئی۔

"آپ اُسکے تایا ہو کر اُسکو ایسی مشکل میں ڈالنا چاہتے ہیں۔" اُسکا انداز اس بار پُر مزاح تھا۔ احمد دُرانی صاحب مسکرا بھی نہ سکے۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ فیصلہ اس بار میرا ہی ہے اور بہت سوچ سمجھ کہ کیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ دوسرا اٹیک بھی تایا جان کو میرے سبب سے آئے۔" وہ اُنکو ہر ممکن تسلی و تشفی کروا رہی تھی اور جانتی تھی کہ اسکا کوئی فائدہ نہیں۔

"میں گھر جانے لگی ہوں۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔" اُنکی خاموشی محسوس کر کے اُسکو سلام دُعا کے بعد رابطہ منقطع کرنا پڑا۔ آفس سے سب سٹاف کو گئے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ پروجیکٹ کی لاسٹ بریفنگ رپورٹ تیار کرنے کے لیے رکی ہوئی تھی۔ لیپ ٹال، ٹیب، چند ضروری فائلز بیگ میں ڈال کر وہ آفس کی لائینس آف کر کے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔ ملک ہاؤس ہمیشہ کی طرح ہر شے سے بیگانہ پوری شان سے کھڑا، رات کو روشن کر رہا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے، باہر نکلتے ہوئے اُس نے ایک نظر تایا جان کے گھر پر ڈالی۔ اس بار وہ سب سے پہلے تایا جان کو بتائے گی تاکہ اور کسی کو خبر

ہو نہ ہو، تایا جان کو ضرور ہو۔ کچھ سوچ کر اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی، مین گیٹ کے ساتھ والا چھوٹا دروازہ کھول کر اندر آتے شخص کو دیکھ کر وہ چونکی جو آج پھر سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نگاہوں کا زاویہ بدل کر آگے بڑھتی، اُسکو ٹھہر جانا پڑا۔ وہ بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کو دباتے ہوئے اندر آ رہا تھا۔

اُس پر نظر پڑتے ہی، دونوں باز پہلو میں آگرے۔ کپٹی میں درد کی اٹھتی ٹیسیں اب ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ وہ جو ساکن ہو گئی تھی، چہرہ پھیرے اُسکو اپنے پاس سے تیزی سے گزرتے دیکھ رہی تھی یوں جیسے وہ اُسکو دیکھنا تک نہ چاہتا ہو۔ کل دوپہر کو جو کچھ اُسکو کہا گیا تھا لگ رہا تھا کہ سمجھ آگئی ہے۔ سر جھٹک کر وہ مُرتضیٰ صاحب کے گھر کی جانب پلٹ گئی۔ سیڑھی پر قدم رکھتے دستگیر نے چہرہ پھیر کر اُسکو دیکھا جو پلٹے بغیر، تیز قدموں سے آبنوسی دروازہ پار کر گئی۔ گہرا سانس لے کر اُس نے اپنا بازو جھٹکا اور پھر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

شار سے فارغ ہو کر الماری کی جانب بڑھتے ہوئے وہ وہاں سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر بیڈ تک آیا اور پھر یو نہی کھڑے کھڑے اپنے ہاتھوں کی پشت پر کاٹن بڈز کے ساتھ وہ مرہم لگا رہا تھا۔ اُن گہرے زخموں میں تکلیف کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بات تشویش کی ہونی چاہیے مگر اُسکو جیسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ٹیبل پر پڑے سیل فون نے وائبریشن کیا اور وہاں ارمان کا میسج "کل ٹیسٹ کروانے۔۔۔" ایک سرسری نظر سیل فون پر ڈال کر وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" صبح سویرے اُسکو دیکھ کر اُنکا منہ جو حلق تک کڑوا ہو گیا تھا، اُسکو لائبریری کی جانب جاتا دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"چین نہیں ہے تمہیں اپنے گھر۔" ٹھنڈے طنز پر اُس نے گہرا سانس لے کر اُنکو دیکھا۔

"تایا جان جاگ گئے ہیں؟" اتوار کی صبح نماز کے بعد تایا جان سوتے نہیں تھے، یہ بات اُسکو معلوم تھی مگر سامنے تن کر کھڑی عورت کو دیکھ کر ضبط کرنا ہی تھا۔

"تم اپنے تایا جان کی جان کب چھوڑو گی؟" اُنکے اگلے چہتے سوال پر زُخرف خاموشی سے اُنکے نفرت سے سُرخ ہوتے چہرے کو دیکھے گئی۔ وہ عورت اُسکی ماں نیلم کی بہن تھی اور ایسا لگتا نہیں تھا۔

"آج کہاں گئی تمہاری وہ زبان جو وزیر آباد کی چھریوں کو بھی مات دیتی تھی۔" کسی بھی قسم کا جواب دیئے بغیر وہ تیزی سے پلٹ کر تایا جان کے گھر سے باہر نکل آئی۔ لمحے بھر کو لڑائی کو بالکل تیار فیروزہ بیگم دنگ، بھونچکا رہ گئیں اور پھر مُٹھیاں پیچ کر پکن کی جانب بڑھ گئیں۔

وہ وہیں سیڑھیوں سے ٹیک لگا کر صبح کی ٹھنڈی ہوا کو آنکھیں موندے اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ شاید یہ چند دن ہی تھے اور پھر اس گھر سے اُسکو نجات ملنے والی تھی۔ یہ چہت اب اُسکو مزید نہیں چاہیے تھی اور اسی سوچ کے ساتھ اُسکے ہونٹوں کو مُسکراہٹ نے چھو لیا۔ کسی کی نظروں کی تپش پر اُس نے یونہی آنکھیں کھول کر چہرہ پھیرا، سفید اور سیاہ ٹریک سوٹ میں ملبوس شخص کو دیکھ کر وہ تیزی سے ٹیک چھوڑ کر سیدھی ہوئی۔ مُسکراہٹ نے واپس غائب ہونے میں لمحہ نہیں لگایا۔ پتہ نہیں اس ایک مہینے میں اور کتنی بار سامنا ہو گا اس شخص سے؟ اُن ہونٹوں سے مُسکراہٹ سمٹتے دیکھ کر دستگیر مُصطفیٰ کا ارتکاز ماند پڑا اور وہ سیڑھیاں اتر کر آگے بڑھ گیا۔

"ارے زری۔۔۔" پیچھے سے واک کے لیے آتے مصطفیٰ صاحب کو اپنے بیٹے کے یوں ساکن ہو جانے کی وجہ نہیں سمجھتے تھے، چونک کر اُسکو دیکھنے لگے جس نے نگاہ غلط تک اُنکے کچھ دور قدم کھڑے، اپنے باپ کا انتظار کرتے بیٹے پر نہیں ڈالی۔

"اسلام و علیکم تایا جان!" اُنکا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا کر اُس نے آہستگی سے کہا۔

"چلو آ جاؤ! آج ہم تینوں واک کرتے ہیں۔" اُسکو دیکھ کر اُنکا موڈ خوشگوار ہوتے دیکھ کر دستگیر نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

"میں بس آپ سے ضروری بات کرنے آ رہی تھی۔" اُسکے کہے جانے پر دستگیر نے چہرہ پھیر کر اُسکو دیکھا۔ سماعتوں میں اپنی ماں کے کان پھاڑتے سوال گونجنے لگے۔

"اچھا۔۔۔ کہو بیٹا، سب خیریت ہے؟" وہ سنجیدگی سے اُسے دیکھنے لگے۔

"جی سب خیریت ہے۔ آج منصور، خولہ آنٹی اور ساحل کے ساتھ گھر آ رہا ہے۔" چہرے پر دُنیا جہاں کی مسکراہٹ لاتے ہوئے اُس نے کچھ قدم دور کھڑے شخص کے اعصاب پر دھماکہ کر دیا۔ مصطفیٰ صاحب نے چہرہ پھیر کر دستگیر کو دیکھا جو پہلے ہی چہرہ پھیر چکا تھا۔

"اچھا۔۔۔ کس لیے۔۔۔؟" اُنکے سوال میں ہمیشہ کی طرح کوئی خوشی نہیں تھی۔

"میں آپ سے کہہ رہی تھی نہ کہ آپ نے بالکل پریشان نہیں ہونا میرے لیے۔ اب آپ اپنے وہم اور خدشات رفع کر کے بس اپنی صحت کا خیال رکھیں گے، ٹھیک ہے۔" دل پر اُترتی قیامت کو دبانے وہ بہت مُجت اور خلوص سے کہہ رہی تھی۔ آنکھیں موند کر دستگیر نے چہرہ مخالف سمت کر لیا۔

"منصور کے کہنے پر میں نے اُس لڑکی پر بُری نظر۔۔۔" وہ منحوس لہجہ پوری قوت سی اُسکی سماعتیں چیرتا ہوا دل میں کسی آہنی تیر کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔

"تو کیا منصور۔۔۔ تم۔۔۔" اُنکو سمجھ نہیں آئی وہ کیا کہیں۔ وہ مُسکراہٹ جو زری کے چہرے پر تھی، وہ آنکھوں تک کیوں نہیں جا رہی تھی۔ اُنکا دل عجیب سی کیفیت سے سکڑنے لگا۔

"شادی کی تاریخ لیئے آرہے ہیں وہ سب۔" یہ الفاظ ادا بڑی ہی سہولت سے کیئے گئے جبکہ مُصطفیٰ صاحب ساکن سے اُسکی آنکھوں کے پار کچھ ٹوٹتے دیکھ رہے تھے اور پھر زُخرف کا ہاتھ بے ساختہ اپنی گردن تک گیا۔ دم گھٹنے لگا تھا۔ مُصطفیٰ صاحب اُسکو دیکھے گئے۔

"منصور جانتا ہے تمہاری بیماری کے بارے میں؟" اُنکے سوال پر دِستگیر جو اُسکو اپنی گردن کی پشت سہلاتے دیکھ رہا تھا، ٹھٹک گیا اور زُخرف کی مُسکراہٹ سمٹتے دیکھ کر مُصطفیٰ صاحب کو لگا وہ یہیں ڈھے جائیں گے۔

"منصور سب جانتا ہے میرے بارے میں تایا جان۔ آپ نے اب سے اپنی صحت اور صرف اپنی فیملی کی فکر کرنی ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا مجھ سے" وہ شاید دِستگیر کی موجودگی بھلا بیٹھی تھی تبھی تو اتنی سہولت سے، آرام سے، تفصیلی بات کر رہی تھی مگر دِستگیر جانتا تھا کہ وہ اُسکو ہی سب سنا رہی ہے۔

"تم بھی تو میری فیملی ہو، میری بیٹی ہو۔" اُنہوں نے اُسکو دیکھا جس نے اس بات پر اُنکا ہاتھ آہستگی سے چھوڑ دیا۔

"آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس خاندان کا حصہ بننا مجھے کتنا ناپسند ہے۔" وہ جانتی تھی کہ اُسکے نرم الفاظ، سخت تھے مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اب اُسکے لیے ہلکان ہوں۔ دیوار کا سہارا لے کر کھڑے دستگیر نے سرخ ہوتی آنکھیں اُس سے پھیر لیں جسکی جستجو ایک سسکتی تاریک رات میں اُس نے اپنے دل سے چلی جانے دی تھی۔

"جانتا ہوں۔۔۔" اُن کو کہنا پڑا کیونکہ وہ جانتے تھے۔ زُخرف دھیرے سے مسکرا دی۔

"اس لیے آپ منصور کو کوئی اسی مہینے کی تاریخ دیجیے گا۔ مجھے اب اس گھر کی چھت کے نیچے نہیں رہنا۔" مصطفیٰ صاحب نمناک ہوتی آنکھوں سے اُسکو دیکھے گئے جو اُنکے لیے سب رشتے ناطوں سے بڑھ کر تھی۔ وہ جانتا تھا وہ اُسکو اپنے معاملات سے باز رکھنے کے لیے سب بتانا چاہ رہی ہے، اس لیے وہ جو جہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا، جم کر کھڑا رہا۔ چھت لفظ نے رُوح زخمی کر دی تھی۔

"میں منصور کے ساتھ تمہیں کبھی رخصت نہیں کرنا چاہتا تھا۔" اُنکی بات پر کانپتے دل سے اُس نے اُنکے دونوں نرم، مضبوط، شفیق ہاتھ نرمی سے تھام لیے۔

"جانتی ہوں۔۔۔۔۔۔ لیکن اب کر دیں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ ہمیشہ میرے لیے پریشان اور غم زدہ رہیں کیونکہ آپ میرے لیے حضرت زکریا علیہ سلام جیسے ہیں۔" اُس نرم لہجے پر دستگیر کو اُس چہرے کی جانب دیکھنا پڑا جو سارے موسموں کی سختی کے باوجود اُس کے دل پر ویسے ہی نقش تھا، اول روز کی طرح۔

"معلوم ہے مجھے۔" اُسکے ہاتھ نرمی سے اپنے ہونٹوں سے لگا کر اُنکو کہنا پڑا۔ وہ اور کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ وہ اُس سے بڑے ہی شرمندہ تھے، بے حد شرمندہ۔

"تم اس گھر کے سب مکینوں کو معاف کر دینا۔" انکی اگلی بات پر زُخرف دھیرے سے مسکرا دی۔

"کس بات پر؟" وہ جانتی تھی کہ تایا جان بہت کچھ جانتے ہیں۔

"ہر بات پر۔۔۔" وہ یونہی اُسکے ہاتھ ہونٹوں سے لگائے کھڑے رہے اور وہ کچھ کہے بغیر دھیرے سے ہنس دی۔ وہ جانتے تھے اس سے زیادہ وہ اُن پر کچھ عیاں نہیں کرنا چاہتی۔

"اب میں اپنا سامان پیک کر لوں۔۔۔ بہت کچھ ہے جو میں یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں۔" اُنکے ہاتھ تھپتھپا کر چھڑواتے ہوئے وہ باقی ماندہ سیڑھیاں اتر کر چہرہ پھیر کر کھڑے شخص کے پاس سے ہمیشہ کی طرح خوشبو کے جھونکے کی طرف گزر گئی۔ دستگیر نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنے بابا جان کو دیکھا جو آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ڈھیروں خفگی، ناراضگی، بے اعتباری لیے اُسکو دیکھ رہے تھے اور دستگیر مصطفیٰ اُنکی آنکھوں کے نہ سمجھ میں آنے والے احتساب پر شل سا کھڑا رہ گیا اور وہ واپس اندر کی جانب چل دیئے۔ آج کی واک منسوخ کر دی گئی تھی۔

اُس گھر کے مکینوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سات سال سے جس زُخرف مُرتضیٰ کے نکاح کا سُنتے آ رہے تھے اب اُسکی رخصتی بالآخر ہونے والی تھی۔ اس گھر کے بہت کم افراد تھے جو اس خبر سے بے حد خوش، شاداں و فرحان تھے اور وہ نام فیروزہ، ماریہ اور نیہا کے تھے جن کے مطابق خس کم جہاں پاک ہونے والا تھا۔ اُسی دوپہر بڑے ہال کمرے میں سب جمع خولہ بیگم کو بہت بُرے دل سے سُن رہے تھے جنکی خوشی دیکھنے لائق تھی۔

"ارے سب بچوں کی خوشی نہیں ہو رہی جو یوں چہرے لٹکائے بیٹھے ہیں۔" ایک طرف بیٹھی ساری ینگ پارٹی کو خاموشی سے بیٹھے دیکھ کر خولہ بیگم نے مسکراتے چہرے سے کہا مگر کسی نے بھی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

"ارے۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ عرصے بعد رخصتی کی بات سُن کر بس سب زرا حیران ہو گئے ہیں۔" اُن سب کو ناگواری سے گھور کر کہنے والی ماریہ بیگم تھیں۔ چونکہ زُخرف کی ساری ذمہ داری مُصطفیٰ صاحب کئی سالوں پہلے لے چکے تھے اِس لیے رخصتی کی بات بھی اُنکے گھر ہی ہو رہی تھی۔

"دیکھو ثمن تم کتنے نصیبوں والی ہو۔ اتنے سالوں سے لٹکی ہوئی رخصتی تمہارے آنے کے بعد ہو رہی ہے۔" کھانے کی ٹرالی دھکیل کر لاتی ثمن کو دیکھ کر خولہ بیگم کی بات پر مُصطفیٰ صاحب نے سخت نظروں سے اُنکو دیکھا جن کے زُبان کے آگے سُکھ گھر کی کچھ خواتین کی طرح خندق تھی۔

"اُسکو مُمی! ڈیٹ فِلِس کریں پلِیز آپ جلدی سے تاکہ ہمارے گھر بھی کوئی ہلا گُھ ہو۔" بیزار سے بیٹھے ساحل نے تیزی سے ماں کو ٹوکا۔

"مَنصور نہیں آیا؟" مُرتضیٰ صاحب کے سوال پر مُصطفیٰ صاحب نے ایک اکتائی نظر اُن پر ڈالی۔

"کل ہی تو ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوا اور بس آتے ہی پیچھے پڑ گیا کہ بہت ہو گیا جائیں اور تاریخ لے کر ہی آئیں۔" وہ مزے سے مسکرا کر کہہ رہی تھیں جبکہ فیروزہ اور ماریہ بیگم نے ایک دوسرے کو خوشگواریت سے دیکھا۔

"کچھ معلوم ہوا کہ کس نے چھتروں کی تھی منصور کی؟" صائم کی جانب سے ایسے سوال کی کسی کو توقع نہیں تھی۔

"کہاں بیٹا، بیڑہ غرق ہو اُن پولیس والوں کا۔ موئے تعاون کرنے پر تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔" اُنکے چہرے سے مُسکراہٹ معدوم ہوتے دیکھ کر اُن سب کے چہرے پر مُسکراہٹ اب دیکھی جاسکتی تھی۔

"وجہ بھی نہیں پتا چلی؟" صائم کے اگلے سوال پر ماریہ بیگم نے تیزی نظروں سے اُسکو دیکھا۔

"بڑے جب بات کر رہے ہوں تو چھوٹے بیچ میں نہیں بولتے۔" فیروزہ بیگم پہلو بدل کر بولیں۔

"دستی بیٹا! یہاں آؤ۔" وہ جو سیڑھیاں چڑھ کر تیزی سے اوپر جانے لگا تھا، ماں کی پُکار پر چونک کر پلٹا اور اُس مجمعے کو یوں ہال میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"ادھر تو آؤ!" اُنہوں نے اُٹھتے ہوئے بڑی مُجت سے پُکارا جبکہ مُصطفیٰ صاحب افسوس سے اپنی بیگم کو دیکھ کر رہ گئے۔ جب ماں کو ہی اپنی اولاد کے احساس و جذبات کا خیال نہ ہو تو کوئی دوسرا کیسے کرے۔

"جی؟" ہال میں داخل ہوتے ہی وہ سب کی نظریں اپنے بے تاثر چہرے پر پڑتے محسوس کر رہا تھا۔ چہرے سے کچھ نہ ظاہر ہونے دینے کا فن وہ کئی سال پہلے ہی سیکھ چکا تھا۔

"ساحل سے پہلے تم نہیں ملے نہ؟" ماریہ چچی نے مُسکرا کر کہا جبکہ دَسْتگیر نے خاموشی سے اُسکو دیکھا جو چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"دستگیر نام ہے نہ آپکا۔۔۔ بھابھی کے تایا کے بیٹے۔" اُسکے مُسکراتے حتمی لہجے پر باقی سب حیران ہوئے جبکہ صرف دستگیر تھا جو یونہی اندر تک اُتر جاتی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"تم جانتے ہو میرے بیٹے کو ساحل؟" فیروزہ بیگم اپنے تجسس کو آسانی سے دبا نہیں سکتی تھیں۔

"جی! اُس دن بھابھی کو کچھ دینے آیا تھا لیکن انکو دینا پڑ گیا۔ اور یہ تب مجھے قتل کر دیتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔" ہنستے ہو کہہ کر اُس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جبکہ فیروزہ بیگم نے اُسکی بات پر چونکتے ہوئے دستگیر کو دیکھا جسکے چہرے پر ڈھونڈنے سے بھی کوئی تاثر نہیں مل رہا تھا۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اندر ہال میں آتی زُخرف کی نگاہ ساحل کے مصافحے کے انتظار میں آگے بڑھے ہاتھ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ دستگیر نے گہرا سانس لیا۔

"لیکن میں ایسا کچھ کہہ نہیں سکتا۔" اُسکا ہاتھ تھام لیتے ہوئے اُسکے سر، مدہم لہجے نے سب کے چہروں کے رنگ کو متغیر کر دیا۔ صائم نے چونک کر مُصطفیٰ صاحب کو دیکھا جو اُلجھی آنکھوں سے دستگیر کے سر دچہرے کو دیکھ رہے تھے۔

"اسلام و علیکم!" زُخرف کے سلام پر سب چونکے سوائے دستگیر کے۔ چونکے بغیر چہرہ پھیر کر اُسکو دیکھا جو قدم قدم مُصطفیٰ صاحب کی جانب بڑھتے ہوئے کڑی نظروں سے اُسکو ہی دیکھ رہی تھی، دستگیر نے ساحل کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے نگاہیں پھیر لیں۔

"کیسی ہیں آپ بھابھی؟" ساحل کا جُوش سب کی سمجھ سے باہر تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، ساحل! تم اور تمہارا بھائی کیسے ہیں؟" اُسکا انداز سب کے لیے نارمل تھا سوائے ساحل حلاج کے لیے۔ اُسکی آنکھیں مُسکرا نے لگ گئیں۔

"آخر ساتھ سال کے طویل انتظار کروانے کے بعد آپ نے کل جا کر میرے بھائی کو گرین سگنل دے دیا۔" ساحل نے مُسکراہٹ دبا کر اُسکو دیکھا جو اُسکی بات سے ذرا نہ گھبرائی تھی۔ باقی سب ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ صوفے پر بیٹھتے دستگیر نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے ایک ایک کا تاثر پڑھ لیا۔

"ہاں! اگر منصور سات سال پہلے ہی میری بات مان جاتا تو اُسکو اتنا انتظار اٹھانا نہ پڑتا۔" ساحل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے اُس نے ساحل حلاج کی مُسکراہٹ غائب کر دی۔ "اب تو آپ پریشان نہیں ہیں نہ تایا جان؟" ساحل کی جانب سے نظریں پھیر کر وہ مُسکراتے چہرے سے مُصطفیٰ صاحب کو دیکھ رہی تھی جو جواباً مُسکرا بھی نہ سکے۔

"لیکن آپ مان کیسے گئیں؟" ساحل کی جانب سے ایسے سوال کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ زُخرف نے اُسکی جانب دیکھا جو واقعی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"کیوں تمہیں لگا تھا میں عمر بھر تمہارے بھائی کو انتظار کی سُولی پر لٹکائے رکھوں گی۔" اُسکی اُس بات پر دستگیر نے چہرہ پھیر کر کھڑکی سے باہر نظر آتے سبزہ زار کی جانب نگاہیں پھیر لیں جبکہ ساحل کا قبہ بے ساختہ تھا۔

"ہاں نہ! میں جس عورت کو اپنی بھابھی کی حیثیت سے جانتا ہوں وہ اتنی آسانی سے ہار مان جانے والوں میں سے نہیں تھی۔" ساحل کی اگلی بات پر ماریہ اور فیروزہ بیگم نے ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ مُرتضیٰ صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔

"اگر آپکو لگتا ہے کہ میں آپکی بیگم کے کہنے پر منصور جیسے شخص سے شادی کر لوں گی تو یہ بُھول ہے آپکی۔ زُخرف ملکہ ہار مان جانے والوں میں سے نہیں ہے۔" آنکھوں کے آگے ہنوز دُھند تھی جو زُخرف کا مطمئن چہرہ دیکھنے نہیں دے رہی تھی۔ لیکن وہ ہار کیوں مان رہی تھی پھر؟ اس سوال پر انہوں نے چہرہ پھیر کر اپنے سب سے بڑے مُصطفیٰ بھائی کو دیکھا اور اُنکی آنکھوں میں ایک دُنیا مسمار ہوتے دیکھ کر مُرتضیٰ حیدر لرز کر رہ گئے۔

دستگیر نے چہرہ پھیر کر زُخرف کو دیکھا جو مُسکراتے چہرے کے ساتھ ساحل کو دیکھ رہی تھی۔ جواب ہنوز نہیں آیا تھا۔

"میں ہار مان جانے والوں، جُھک جانے والوں میں سے نہیں ہوں ساحل حلاج۔" اُسکے اطمینان میں ذرہ فرق نہیں آیا۔

"باقی تم اپنے بھائی سے پوچھ لینا کہ جیتا کون ہے اور ہارا کون۔" اُسکی آنکھوں کا تاثر سب کو چونکا رہا تھا۔ ساحل اُسکو یونہی خاموشی سے دیکھے گیا۔ کہیں۔۔۔؟

"ایک سیکنڈ۔۔۔ ایک سیکنڈ۔۔۔ کیا منصور بھائی آپکی شرط مان گئے؟" ذہن میں جیسے جھماکہ ہوا اور اُسکے یوں اُچھل کر کہنے پہ زُخرف کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

"مجھے لگتا تھا تم کو نیک ویڈ ہو۔" وہ مسکرائے جا رہی تھی اور اُسکی یہ مسکراہٹ دیکھنا دستگیر مصطفیٰ اور مصطفیٰ حیدر کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔

"ارے می! منصور بھائی تو بڑے چھپے رستم نکلے۔" ماں کی جانب چہرہ پھیرتے ہوئے اُسکی حیرانگی کم نہیں کو رہی تھی جبکہ باقی سب نا سمجھی اور لاعلمی سے یہ سب دیکھ رہے تھے سوائے دستگیر مصطفیٰ کے جو پھر سے کھڑکی سے باہر دھوپ میں جلتے شجر کو دیکھ رہا تھا۔ جو سایہ کرتے کرتے خود نڈھال ہو رہا تھا، جل رہا تھا مگر کسی کو اُسکی خبر نہیں تھی۔

"بھائی صاحب! میں آپ سے یہی بات کرنے آئی تھی کہ منصور کہہ رہا تھا ہم برات والے دن پھر سے نکاح رکھیں گے جس میں سب افراد گواہ بن سکیں۔" اُنکی اگلی بات پر دستگیر مصطفیٰ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ یونہی کب کی خالی ہو چکی آنکھوں سے ایک عمر سے دھوپ میں جھلستے اُس برگد کو دیکھ رہا تھا، جسکی مضبوط جڑیں اُسکو کسی بھی طوفان کے سامنے جما کر کھڑا رکھے ہوئے تھیں۔

"تو یہ تھی تمہاری شرط؟" مصطفیٰ صاحب نے خاموشی توڑی اور جس لہجے میں توڑی، زُخرف نے اُنکو دیکھا جو اُسے بے حد ملال اور دُکھ سے دیکھ رہے تھے۔

"بس خواہش تھی تایا جان۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے نکاح کے سب سے پہلے گواہ آپ ہوں۔" اُنکی جانب بڑھتے ہوئے وہ بہت مُجت سے کہہ رہی تھی جبکہ صائم کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے چہرہ پھیر کر دستگیر کو دیکھا جو یہاں ہو کر بھی یہاں نہیں تھا۔

"تو پچھلے نکاح میں تمہارے گواہ تایا جان کیوں نہیں تھے پھر؟" صائم کے سوال کی سختی سب نے ہی محسوس کی مگر دستگیر نے خصوصاً چہرہ پھیر کر اُسکو دیکھا جو سوال زُخرف سے کر رہا تھا مگر نظریں اپنی جانب چونک کر دیکھتے دستگیر پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اُسکے کچھ معلومات فراہم کر رہا تھا کیا؟؟

ساتھ بیٹھی ثمن نے جلدی سے اُسکو ٹھوکا دیا کیونکہ زُخرف کے چہرے کی مُسکراہٹ سمٹنے لگی تھی۔ سفید پڑتے چہرے سے ماریہ بیگم اُسکو دیکھ رہی تھیں جو کبھی بھی، کچھ بھی کہہ کر یہاں ایک قیامت برپا کر سکتی تھی۔

"پہلے تو کر لیا نہ اپنے دل کی مرضی سے۔ اب چاہتی ہے کہ اُسکے تایا جان شامل ہوں تو تم سب کیوں اُسکو ایسے شرمندہ کر رہے ہو۔" ماریہ بیگم کی جانب سے ایسے جواب، ایسے بات کی کسی کو توقع نہیں تھی یہاں تک کہ فیروزہ بیگم کو بھی۔ چہرہ پھیر کر وہ پھیلتی آنکھوں سے اُنکو دیکھ رہی تھیں جنکا چہرہ سپید پڑنے لگا۔ مُصطفیٰ صاحب نے زُخرف کو دیکھا جو بہت خاموشی سے اپنے باپ کی دوسری ماں کو دیکھ رہی تھی اور ماریہ بیگم۔۔۔ اُنکو لگا بس کھیل ختم!

چہرہ پھیر کر زُخرف نے تایا جان کو دیکھا جن کی آنکھوں میں ڈھیروں سوال، خدشات، شکوک و شبہات، اور تفکرات تھے۔ اُسکو مُسکرا دینا پڑا۔

"زندگی میں پہلی بار مجھے آپ سے اختلاف نہیں ہوا۔" چہرہ پھیر کر اُس نے اڑی رنگت والی ماریہ بیگم کو اپنے الفاظ سے نئی زندگی عطا کر دی تھی جبکہ دستگیر کی پلٹتی نگاہ، اُن چکنا چُور ہوتی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اُن آنکھوں میں اُسکے لیئے اجنبیت اور بے رُخی کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی مُوجزن تھا جسے اس سے پہلے کہ وہ کوئی نام دیتا، وہ سُنہری آنکھیں اُس سے بے پرواہ ہو کر رُخ بدل گئیں۔ مُرتضیٰ

صاحب ساکن سے اُسکو دیکھ رہے تھے جسکی آخری بات بہت کڑی تھی اور جس نے اس پورے گھنٹے میں، آنے سے لے کر اٹھ کے جانے تک ایک بار بھی اُنکو دیکھا نہیں تھا۔ جیسے وہ۔۔۔ سرے سے موجود ہی نہ ہوں۔

-اپنے زور سے اُن کو تم نے دل میں بسائے رکھا تھا

تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔ مطلب قیدی بھاگ گئے؟؟

اپنے کمرے سے ملحقہ اُس پوشیدہ سٹڈی میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے اُسکا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ جس کو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، سارے خیالات بے لگام ہو کر اُسکی جانب ہی دوڑے جا رہے تھے۔ سر جھٹکتے ہوئے اُس نے چہرہ اٹھا کر اُس شیشے کی جانب دیکھا جہاں مختلف تصاویر، اخبار کے تراشے، بینک اکاؤنٹس اور کال لاگ کی ڈیٹیلز اور نہ جانے دُنیا جہان کی کون کون سی معلومات ایک سُرخ رنگ کے دھاگے سے ایک دوسرے سے جوڑی گئی تھی۔ ہاتھ آگے بڑھا کر اُس سُرخ دھاگے کے گزرنے کے راستوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسکا ذہن پھر بھٹکنے لگا۔

"تو پچھلے نکاح میں تمہارے گواہ تایا جان کیوں نہیں تھے پھر؟" اس گونجتے سوال پر دائیں جانب چسپاں تصویر کو دیکھتے ہوئے اُسکی آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ وہ چہرہ جس شخص کا تھا، اُس شخص سے زُخرف شادی کرنے والی تھی صرف دو دن بعد۔ ماحول میں آکسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی مگر وہ یونہی ساکن سا کھڑا رہا۔ کچھ تھا جو اُسے بے چین کر رہا تھا۔

"ارمان!" سیل فون کان سے لگائے، نظریں منصور کے چہرے پر موجود اُس بھیانک نشان پر ٹکائے، اُسکی آواز اتنی مدہم تھی کہ ارمان چونک کر سیدھا ہوا۔

"سب خیریت ہے نہ؟" وہ اُسکو لہجے کے اتار چڑھاؤ سے جان جاتا تھا۔

"تم جانتے ہو میں کیا چاہتا ہوں؟" اُسکی نگاہیں اپنا فوکس اُس تصویر سے کھولنے لگیں۔

"جانتا ہوں۔۔۔۔۔" ارمان کو جیسے سب معلوم تھا۔

"کیا۔۔۔۔۔؟" وہ حقیقتاً یہ جان لینا چاہتا تھا۔

"تم نہیں جانتے؟" تھکے ہارے ارمان کو اپنا نرم بستر چھوڑ دینا پڑا۔

"کچھ دن پہلے تک جانتا تھا مگر اب لگتا ہے جیسے وہ سب جھوٹ تھا۔ میں خود سے، تم سے جھوٹ کہتا آیا ہوں۔" ہاتھ بڑھا کر خود کی جانب تمسخر سے دیکھتی اُس تصویر کو کھینچ کر اتار لیا گیا۔

"تم جانتے ہو دستگیر کہ وہ تمہارے لیے نہیں ہے۔" ارمان کی بات میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ دستگیر نے مٹھی بینچتے ہوئے وہ تصویر بھی مسل دی۔ ارمان جب دستگیر کہہ دے تو بات ختم ہو جاتی تھی۔

"جانتا ہوں۔۔۔۔۔ سب تسلیم ہے مجھے۔۔۔۔۔ لیکن میں۔۔۔۔۔" پاس پڑے ڈسٹ بین میں وہ تصویر پھینکتے ہوئے اُسکا دماغ بالکل بلینک ہو رہا تھا۔

"دیکھ دستگیر۔۔۔۔۔ میں ہر حال میں، ہر فیصلے میں تیرے ساتھ ہوں۔ تُو چاہتا ہے نہ کہ منصور کی اصلیت سب کے سامنے لا کر زُخرف کو اندھی کھائی میں گرنے سے بچالے تو میں اس میں بھی تیرے ساتھ ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اگر تُو اُسکو اپنے لیے چاہ رہا ہے تو میں تیرے ساتھ نہیں ہوں، کبھی بھی۔ ایسا مجھے جبر

سے کہنا پڑ رہا ہے۔ اُس وعدے کی وجہ سے جو میں نے تجھ سے کیا تھا۔ "اور ارمان کچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہا تھا۔ دستگیر نے گہرا سانس لے کر گردن کے پیچھے ہاتھ رکھ کر، چہرہ اُپر اٹھایا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ بابا ہارٹ پینشنٹ ہیں۔ اُنکو ایک اٹیک آچکا ہے۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے زُخرف سب کچھ بابا کے لیے کر رہی ہے۔" گردن سہلاتے ہوئے اُسکی آواز میں شکستگی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیرے بابا کے لیے وہ کیوں اپنی زندگی جہنم کرے گی۔" ارمان کو سرے سے بات سمجھ نہیں آئی۔

"زُخرف کو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اُسکا میرے باپ سے کیسا رشتہ ہے، میرے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کچھ اور بھی ہے ارمان۔۔۔۔۔ اس سب کے پیچھے کوئی ایسی وجہ، ایسی بڑی وجہ پوشیدہ ہے جسکے لیے وہ منصور سے شادی کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ وہ میرے بابا کو کسی بڑے صدمے سے، غم سے بچانا چاہتی ہے۔" وہ ایک سِر اِپکڑ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسری جانب ارمان کو اُسکی باتیں مزید پریشان کرنے لگیں۔

"اس سے تیری کہی ایک بات تو ثابت ہو گئی۔" ارمان کے کہنے پر وہ جو کچھ اور سوچ رہا تھا، چونک گیا۔

"کونسی بات؟" اُس سوال پر ارمان نے تیزی سے فون کان سے ہٹا کر گھورا۔ اُسکو دستگیر سے اس غائب دماغی کی توقع نہیں تھی۔

"کہ منصور، زُخرف کا شوہر نہیں ہے۔ وہ سات سال سے اُسکے نکاح میں نہیں ہے۔" ارمان کی بات پر اُس نے گہرا سانس لیا۔ دل سے کوئی بوجھ سایہ سُن کر ہٹتا محسوس ہونے لگا۔ نا اُمیدِ دل ڈھارس پانے لگا۔ کوئی ایک بات تو ایسی تھی جو دل کو دھڑکنے دے رہی تھی ان حالات میں بھی۔

"لیکن کیا یہ سوچ تیرے گھر والوں کے دماغ میں نہیں آئی۔۔۔؟" ارمان ابھی بھی اُلجھا ہوا تھا۔
 "کونسی سوچ۔۔۔؟" دستگیر کی اتنی غائب دماغی، ارمان کو متفکر کرنے لگی۔

"جو بات تم نے مجھے کہی کہ اگر منصور سے اُسکا نکاح ہوا تھا تو وہ دوبارہ سب کی موجودگی میں نکاح کیوں کروا رہی ہے۔" ارمان نے بڑے ضبط سے بات مکمل کی۔ بس ابھی کال ختم ہو گی اور یہاں وہ ڈاکٹر آزیلا وجاہت کو کال کر کے اُسکے سابق مریض کی حالت بتائے گا۔

"ان سب میں اتنی سمجھ بوجھ ہوتی تو رونا ہی کس بات کا تھا۔" وہ تو جیسے ایک زمانے سے خفا بیٹھا تھا، تمسخر سے ہنسا

"اچھا دفع کرو یہ سب اور بتاؤ کرنا کیا ہے اب؟" ادھر قاسم مزید زبان کھولنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"بے فکر رہو۔۔۔۔۔ دو دن بہت ہوتے ہیں۔ اُسکی کھال اُدھیڑ کر سب کھایا پیا اُگلوا لوں گا۔" اُسکے لہجے کی سختی پر ارمان نے ہاتھ مَسلے۔

"اگر وہ اتنے تشدد سے مَر گیا۔۔۔" ارمان نے کہنا چاہا۔

"مجھے تم سے اس بے وقوفانہ بات کی توقع نہیں تھی۔" دستگیر کے لہجے کے افسوس پر ارمان کا چہرہ سُرخ ہوا۔

"تمہارے تشدد سے وہ جو سارے لوگ زندہ رہے وہ تھے جن کو تم زندہ رکھنا چاہتے تھے اور یہ۔۔۔ اس سے تمہاری قلبی اور ذاتی دشمنی ہے۔" ارمان نے دانت پیس کر کہتے ہوئے دستگیر کو مُسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"بے فکر رہو اس قلبی اور ذاتی دشمن کو اتنی آسان موت نہیں آئے گی۔ کچھ بتائے بغیر یہ مرا تو ملک الموت کے شکنجے سے بھی کھینچ لاؤں گا۔" اُسکے لہجے میں سخت ارادے اور سفاکیت بول رہی تھی۔ ارمان کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

"کل سب کچھ تیار رکھنا اور میکس کو بھی اطلاع کر دینا۔ دیکھتے ہیں یہ قاسم کب تک اپنے مالک کا وفادار رہتا ہے۔" اُس سرد لہجے پر ارمان نے سر ہلا کر تیزی سے کال منقطع کی اور پھر وہ واقعی ڈاکٹر ازبیلہ وجاہت کو کال ملا رہا تھا۔

"اسلام و علیکم ارمان۔۔۔ ایوری تھنگ از فائن؟؟" اُسکو ان دونوں کی کال کبھی بھی خوش آئیند نہیں لگتی تھی تبھی محتاط ہو کر پوچھا گیا۔

"وعلیکم اسلام۔۔۔۔۔ کچھ ٹھیک نہیں ہے بیلا!" ارمان کی سوچتی آواز پر وہ اپنے آفس کا دروازہ دھکیل کر اندر آگئی۔

"کیا ہوا ہے۔۔۔۔۔ ڈیسٹر تو ٹھیک ہے؟" ارمان کی خاموشی اُسکا دل ڈرا رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ ڈیسٹر ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر ازبلا وجاہت۔" اُسکی سنجیدہ آواز پر ازبلا نے لڑکھڑا کر پاس پڑا ٹیبل تھام لیا۔ پل بھر کے لیے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی تھی۔

"تم اُسکا خیال رکھو۔۔۔ میں کل ہی پاکستان آ رہی ہوں۔" اپنے شیڈول کو سرے سے نظر انداز کر کے وہ ڈائری نکال کر اُس پر ٹیکٹ کروانے کا ریمائنڈر لکھ رہی تھی اور ارمان نے گہرا، سُکھ بھرا سانس لیا۔

حبّاری ہے!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔۔۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ اَحِبَّابُ۔۔۔۔۔

ناولز کی دنیا کے ناولز میں خوش آمدید۔۔۔۔۔

ناولز کی دنیا "ویب سائٹ / گروپ / پیج" دے رہا ہے تمام لکھاریوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں آپ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے قلم سے تحریر کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔۔۔ اگر آپ کو بھی اللہ کی طرف سے یہ صلاحیت دی گئی ہے تو اسے اجاگر ضرور کریں۔۔۔ ہمیں آپ جیسے ہی لکھاریوں کی تلاش اور ضرورت ہے۔۔۔

اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں۔۔۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ جتنا جلدی ہو سکا آپکی تحریر پوسٹ ہو جائے گی۔۔۔

مزید تفصیلات یا کسی بھی طرح کی مدد کے لیے ہم سے گروپ یا پیج انباکس میں رابطہ کریں یا ای میل پر ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔۔۔

Email address :- Novelskiduniya77@gmail.com

NOVELS KI DUNIYA (WEB, FB Page, FB Group, Insta Pg, Youtube Channel)

Facebook page :- [Novels ki duniya](#)

(user name [@zoyatalib77](#))

Facebook group :- [Novels ki duniya](#)

Instagram Page:- [Zoya Talib](#) (UserName: [Novelskiduniya77](#))

Youtube Channel: Novels Ki Dunya (NKD) Official

(پر خیال رہے کہ یہ گروپ زویا طالب کا ہی ہو)

اور باقی کے رابطے کے لیے ہر پیج کے نیچے **Blue** الفاظ میں لکھے لفظ میں آپکو لنکس مل جائے گے ان سب کے۔۔

لکھا ہے ان دونوں کو وزٹ کرنے کے لیے لکھے ہوئے پر ہی کلک کریں اور اوپن کر لیں۔۔۔

شکریہ۔۔۔۔۔

ZT

Novels Ki Duniya